اسلامی تحریک کا مجاہد

۱۸۶۳ء کے ایک مجاہد کی درد انگیز داستان
جس نے اپنا سب کچھ لٹا کر اللہ کی خوشنودی حاصل کی۔

محمد جعفر تھانیسری

دکن پبلشرز اینڈ پرنٹرز لمیٹڈ
حیدر آباد (دکن)

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

دکن پبلشرز اینڈ پرنٹرز لمیٹیڈ
حیدرآباد دکن

باہتمام
محمد عثمان مینجنگ ڈائرکٹر

جنوری ۱۹۴۸ء

مطبوعہ
مطبع دستگیری
حیدرآباد دکن

تقریبِ اشاعت

۱۸۵۷ء ـــــ مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کا آخری شعلہ بھڑک کر خاموش ہو چکا تھا ـــــ خداوندانِ فرنگ نے کل کے شہنشاہ اور آج کے غلام ـــــ مسلمانوں کو کچلا اور اس طرح کچلا کہ پھر صدیوں تک سر نہ اٹھا سکیں ـــــ لیکن مسلمان بڑا سخت جان ہوتا ہے اس کی خاکستر میں کتنی ہی ایسی چنگاریاں پنہاں رہتی ہیں جو پھر شعلہ بن کر نمایاں ہوتی ہیں ـــــ ایک ایسا التہاب شدید کہ جو باطل سوز ہوتا ہے ـــــ شرار بولہبی ہمیشہ چراغ مصطفوی سے ٹکرانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

حسین سے لیکر جناح تک ہزاروں یزید پیدا ہو چکے ہیں ـــــ اور شاید قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ان کی قسمت میں ازلی و ابدی ناکامی ہے۔

ـــــ ممکن ہے کوئی یزید کسی حسین کو شہید کرنے میں کامیاب ہو جائے لیکن حسینیت کو مٹا نہیں سکتا ـــــ چراغ مصطفےٰ ازل سے روشن ہے اور انشاءاللہ ابد تک اسی شان سے جگمگاتا رہے گا کہ اس کا محافظ خود وہ ذات باری ہے جس کا اقتدار ہر اقتدار سے بلند اور جس کی حکومت ہر حکومت پر بھاری ہے

۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے بعد جب انگریزی جبر و استبداد کے ہر شش غظیم سے مسلمانوں پر پے بہ پے قہر کی بجلیاں گر رہی تھیں اور مسلمانوں کے معصوم بچوں اور عورتوں سے لے کر پیر صد سالہ تک ہر ایک الاماں والحفیظ پکار رہا تھا۔ ان کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور اللہ نے جیسے انکی ہوا اکھاڑ دی تھی کہ بعض بزدل اقوام کو بھی اپنی کینہ نکالنے کا موقع ہاتھ آیا وہ کمزور اور بکھرے ہوئے مسلمانوں کے سامنے صف آرا ہو گئیں زمین و آسمان دونوں نے ملکر مسلمانوں کو پیس دینا چاہا ـــــ ٹھیک اس وقت ایک عاشق رسول دیر و حسین ابن علی انگڑائی لے کر اٹھا ؂

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے　　رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ ـــــ !

مجاہدین اسلام کی ایک جماعت تیار ہو گئی جس نے ایک مرتبہ پھر بتا دیا کہ مسلمان موم کی ناک نہیں! شہادت مقدر تھی ـــــ یزید کی تلوار پھر ایک مرتبہ حسین کے گلے کا ہار بن کر رہی مجاہدین تتر بتر ہوئے۔ ایک ایک پھر چن چن کر تباہی و بربادی لائی گئی ـــــ پھر محمد جعفر تھانیسری جمعیت مجاہدین کے رکن رکین کیسے محفوظ رہ سکتے تھے ـــــ دعویٰ بڑا تھا آزمائش بھی سخت ہوئی اور اللہ ہی نے اس آزمائش میں کامیاب بھی کیا ـــــ

—— اوراقِ پیشیں نہی آزمائش، کرب و بلا کی ایک کہانی ہے۔ جس پر کچھ کہنا میر منصب نہیں۔

یہ کتاب خود تھانیسری رحمتہ اللہ نے اپنی صعوبتوں کے ختم ہونے کے بعد تواریخ عجیب المعروف بہ تاریخ عجیب کے نام سے چھاپی تھی۔ جو اس کی عیسوی اور ہجری تاریخ اشاعت بھی تھی —— کچھ دنوں کے بعد اقبال اکیڈمی لاہور نے کالا پانی کے نام سے دوبارہ چھاپا اور اس طرح یہ بھولی ہوئی کہانی پھر ایک مرتبہ تازہ ہو گئی ہے

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را ۔۔۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پھر ایک مرتبہ تاریخ نے خود کو دہرایا ہے۔ ایکٹ ینل ونرات کے کنارے نہیں جمنا کے تیر" مسلمانوں کی قتل گاہ تعمیر ہوئی پھر ایک مرتبہ نمرودیت و یزیدیت کے اژدھے منہ پھاڑ کر دوڑے ہیں پھر آسمان کو ابن اذر و ابن علی کا انتظار ہے پھر زمین اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی اور محمد جعفر تھانیسری کے ورود کی متمنی ہے ——
ایسے میں دکن پبلشرز اپنی نشر و اشاعت کا آغاز اسی مبارک کتاب سے کر رہا ہے اور خود کو مبارک سمجھے گا۔ اگر کسی ایک آنکھ میں بھی روشنی کی ایک چمک اور کسی ایک دل میں بھی گرمی کی ذرا سی تپک پیدا ہو سکی ہے

سینۂ ابن علی سے خون تازہ ہی رواں ۔۔۔ ہو سکے تو اس لہو سے پھر بپا طوفان کر
شراب کہنہ ہے اور نشہ تیز آب حصول لذت آپ کے کام و دین کا کام ہے

ہم نے اس کتاب کا نام اس مرتبہ "اسلامی تحریک کا مجاہد" رکھا ہے کہ یہی مناسب معلوم ہوا۔ وما توفیقی الا باللہ

محمد عثمان (علیگ)
مینجنگ ڈائرکٹر

اسلامی تحریک کا مجاہد

اسلام کی شریعت میں ہر وہ کوشش حرام ہے جو حقیقت کے راستہ سے دور ہٹا دیتی ہے۔ اس لئے ہر مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بساط کے موافق باطل کو سرنگوں کرنے اور حقیقت و صداقت کو سربلند کرنے میں انتہائی کوشش صرف کر دے اسی جذبہ اور قوت عمل کو جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ اغیار کی کینہ پروری اور اسلام دشمنی نے جہاد کا مفہوم مسخ کرکے مسلمانوں کے بالکل خلاف بنایا ہے لیکن مسلمان کی نظر میں جہاد کا صحیح مفہوم یہ ہے :-

"امر بالمعروف اور جہاد ایک ہی حکم کے دو نام ہیں ہر وہ کوشش جو حق کے لئے ہو، ہر وہ صرف مال جو سچائی اور نیکی کی خاطر ہو ہر محنت یا مشقت جو صداقت کے نام پر ہو۔ ہر وہ تکلیف و مصیبت جو اپنے جسم و جان پر راہِ حق میں برداشت کی جائے۔ ہر وہ قید خانے کی زنجیر جو اعلانِ حق کی وجہ سے ہو، ہر وہ پھانسی کا تختہ جس پر جمالِ حق و صداقت کا عشق لیجا کر کھڑا کرے، غرض کہ ہر قربانی جو بذریعہ جان و مال، اور زبان و قلم حق کی راہ میں کی جائے جہاد فی سبیل اللہ ہے۔"

"اسلامی تحریک کا مجاہد" ایسی ہی ایک قربانی ہے۔ ایک مجاہد کی زہرگداز

خود نوشت داستان ہے ایک عاشق رسول کی دلگداز روداد حیات ہے. جو بیسویں صدی کے مرکز سے ہٹے ہوئے مسلمانوں کے بجھے ہوئے قلوب میں گرمی اور تڑپ پیدا کرکے پھر ایک بار براہیمی کرشمہ دکھا سکتی ہے یہ اس انسان کی صعوبتوں کی کڑیاں ہیں جس نے قوم، وطن، دین اور ایمان کی حمایت میں بیس برس دنیا کی جاہ و حشمت سے بے نیاز ہو کر ٹھکرائے ہوئے انسانوں کی سی زندگی بسر کی۔ نیند کے متوالے اور شراب و کباب کے رسیا عوام کو زندگی کی جولانیوں سے ہم کنار کرنے کے لئے اپنی آرزوں اور تمناؤں کو بھینٹ چڑھا دیا اور زمانے کے سرپٹ جانے والے گھوڑے کی ٹاپوں سے روندی جانے والی قوم کے سمند سبک خرام کو مہمیز لگائی اور تابناک منزل حیات کی راہ پر ایثار و قربانی کے نشان چھوڑے۔

ایک زمیندار، ایک رئیس ——— آسودگیوں میں آنکھ کھولی، آرام و راحت نے پروان چڑھایا، جاہ و حشم اور زر و دولت نے لوریاں دیں لیکن جب ایک بلند نصب العین اور قوم کے روشن مستقبل نے اسے جھنجھوڑا تو وہ کانٹوں پر کھڑا ہو گیا، آلام و مصائب کو گلے لگا لیا۔ فرنگیوں نے اس حال میں رکھا کہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں اور دونوں طرف مسلح سپاہی طمنچے لئے ہوئے، انگریزوں کی بدگمانی اس عاشق رسول کے لئے جہنم کا عذاب بن گئی۔ لیکن خدا پر ایمان و ایقان رکھنے والا ان فرنگی روباہ کاروں سے کیا گھبرانے والا تھا، موت کی دھمکی اسے تھوڑا ہی ڈرا سکتی تھی ظلم کی حد تو دیکھئے۔ اس قدر پیٹا گیا کہ یہ بیہوش ہو کر گر پڑے اور مارنیوالے مایوس ہو کر جیل کی کوٹھڑی سے چلے گئے یہ جیسے روز کا معمول تھا ذرا اسے خود انہیں کی زبان سے سنیے۔

"آٹھ بجے صبح سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہو لیکن بفضلِ الٰہی میں سب سہہ گیا۔ اپنے رب سے یہی دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب! یہی وقت امتحان کا ہے۔ تو مجھے ثابت قدم رکھیو۔ جب وہ ہر طرح مایوس ہو گئے تو لاچار آٹھ بجے رات کو مجھے جیل خانہ بھیج دیا۔ میں تمام دن روزہ سے تھا بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار کر لیا۔"

الاماں والحفیظ! یہ سختیاں، یہ صعوبتیں اور ادھر برداشت کی قوت، خدا پر بھروسہ اور استقامت و استقلال کا غیر متزلزل ثبوت! دودھ اور گھی میں نہانیوالا اجیل کی مٹی اور بالو ملی ہوئی روٹی اور موٹے موٹے ڈنٹھلوں کی ترکاری کھاتا اور خدا کا شکر بجالاتا تھا۔ لیکن کیوں اس نے جنت کی سی زندگی چھوڑ کر آزمائش اور صعوبت کی پر خطر وادی میں قدم رکھا؟ پھولوں کی سیج کیسطرح نرم و گداز بستر چھوڑ کر جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند رہا؟ لوہے کی زنجیریں پہنیں، کوڑے کھائے؟ آخر کس لئے اس نے جانوروں سے بدتر زندگی کو ترجیح دی؟

یہ بڑی عجیب داستان ہے لیکن جتنی حیرت انگیز ہے اس سے کہیں زیادہ عبرتناک ہے۔ اسمیں قوموں کے عروج و زوال کے راز مضمر ہیں۔ شمشیر و سنان اول طاؤس و رباب آخر کی تفصیل ہے۔ یوں تو مسلمانوں کی تاریخ عجیب نشیب و فراز سے بھری ہوئی ہے اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں نشیب زیادہ اور فراز کم ہیں۔ ہندوستان کی تن آسانی اور مدھ بھری فضاؤں نے ہندی مسلمانوں کی فطرت اور ذہنیت پر عجیب اثر ڈالا ہے۔ تلوار کی دھار پر زندہ رہنے والوں نے راگ و رنگ کا سہارا لیا۔ باپ دادوں کی غیرت و حمیت اور اسلامی جرأت و شان کو "خالِ ہندو" پر قربان کر کے انفرادی اغراض کیلئے قوم کو ذبح کر ڈالا۔ تیمور و بابر نے ہندوستان فتح کیا۔ لیکن باہر سے آنیوالوں نے ہمیشہ مذہب اور عقائد

سے زیادہ اپنی تلوار پر بھروسہ کیا جب ذرا قدم جمے تو زندگی کے بنیادی اور اہم عناصر کو ترویج دینے کے بجائے کافروں سے میل جول پیدا کر لیا' ان کی بیٹیوں سے شادیاں کر لیں' اسلامی عقائد' اسلامی شعار اور اسلامی نظام حیات کو وسعت دینے کے بجائے اس کے سہارے اپنی شوکت اور دبدبے کی خیر مناتے رہے اس غفلت اور تن آسانی اور کافری خون کی آمیزش نے انکے اسلامی جذبہ کو آہستہ آہستہ دبا دیا وہ آگ جو کوہستانوں سے لے کر نکلے تھے ہندوستان کے سبزہ زاروں میں حسن و عشق کی شبنم سے سرد پڑ گئی جرأت اور بہادری کا شعلہ عیش و آرام کی سرد ہواؤں میں بجھ گیا اور مسلمان فقط راکھ کا ڈھیر بنکر رہ گئے۔

ہم اپنے اسلاف کی حکومت کو الزام دینا نہیں چاہتے لیکن حقائق کی پردہ پوشی تحصیل حاصل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں ننگی عورتوں کا رقص ہوا کرتا تھا؟ کسے معلوم نہیں کہ اودھ کے دربار میں مردوں نے زنانوں کا روپ دھار لیا تھا۔ بادشاہت راگ و رنگ اور رقص و سرود کا دوسرا نام تھی اور تاج و تخت لونڈیوں اور رنڈیوں کی لغزش پا پر ڈگمگاتے تھے۔ قومی اقتدار جب اسطرح ساغروں میں ہلکورے لینے والی شراب کیساتھ اٹھنے اور بیٹھنے لگا تو مولوی اور عالم کب اپنی جگہ ٹھیر سکتے تھے اسلامی حکومت کے نام پر بادشاہت کرنیوالوں نے تو کبھی اسلام کی خدمت کی نہیں ہمیشہ تلوار کی دھاک پر اقتدار قائم رکھا اور پھر جب تلوار صدیوں سے نیام کے اندر پڑی ہوئی زنگ کا شکار ہو رہی تھی تو پھر کون سی چیز کفر و الحاد کی طاغوتی قوتوں کو روک سکنے والی ہو سکتی تھی؟ نتیجہ ظاہر ہے۔ ہندوؤں نے اپنا اثر جمایا' ان کے رسم و رواج نے زور پکڑا مسلمانوں کے دلوں پر جیسے مہریں لگ رہی تھیں' ان کے جوش و جذبہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا' شرک' کفر اور بدعتوں کے سہارے دنیا دار مولوی اپنے

حلوے مانڈے کا سامان پیدا کر رہے تھے اور قوم دن بدن شیطان کے جال میں مضبوطی کے ساتھ جکڑی جا رہی تھی۔ قبر پرستی جیسے جزو ایمان ہو چکی تھی (العیاذ باللہ) پنجاب کے مسلمان قرآن و حدیث کے بجائے مولویوں کی کہاوتوں اور قبروں پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ سارے ہندوستان میں ظلمت و جہالت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور ہر فرد آنکھیں بند کیے ہوئے اس کی طاغوتی لہروں پر بہا چلا جا رہا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے آغاز ہی میں زندگی اور ہلاکت کے بیشمار مراحل طے کئے چنگیزیوں اور تاتاریوں کے سیلاب ہلاکت سے اُسے سابقہ پڑا۔ متعدد حکومتیں دیکھیں حاکم و محکوم کے مراحل سے بھی گزرا، سطوت و جلال بھی دیکھا اور تلخیوں کے جام بھی پیئے۔ لیکن ہندوستان میں جن حالات کے تحت روز بد دیکھنا پڑا وہ بالکل جدا تھے۔ اسلام دنیا کی ہر طاقت اور ہر آفت کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن اپنوں کی منافقت کو دبا نہیں سکتا اور باہم ہر جگہ خود غرضی، مصلحت اندیشی نے ہر مسلمان کو اسلام کا دشمن بنا دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس سبق کو بھلا دیا جس کو وہ ابھی تک سینے سے لگائے ہوئے تھے وہ ماحول سے اسلام کو ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ اسلام صرف اسلام کی صورت میں باقی رہ سکتا ہے اور یہاں خود مسلمان اس کو مسخ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسے طوفان اور ایسی سرکش موجوں سے سفینے کو نکالنا کسی معمولی انسان کا کام نہیں تھا، سارے عوام سے دشمنی مول لینا اور مخالف قوتوں کے مقابل میں ڈٹ کر آخر دم تک مقابلہ کر کے جام شہادت پینا اُسی کا کام ہے جس کو خدا توفیق اور جرأت و جذبہ اسلامی دے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہر قوم کی ترقی و تنزل کے انتہائی مدارج پر اس میں یگانۂ روزگار افراد پیدا ہو جاتے ہیں اور علم و عمل کے ہر شعبہ میں ایسی ہستیاں نمودار

ہو جاتی ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ اور مسلمانوں کی تباہی اس لحاظ سے اہم تھی، ایک طرف عبرت تھی، اور دوسری طرف ہلاکتیں، حسرتیں، اور مایوسیاں! اسی تلاطم میں مسلمانوں کی سطوت نے ایک سنبھالا لیا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا شاہ اسمٰعیل! اس نے زندگی کی ان تمام صعوبتوں اور کڑیوں کو برداشت کرنے کی عادت ڈالی جو انسان کو کندن بنا دیتی ہیں۔ علوم کے ساتھ عقل اور عمل سے کام لیا، یوں تو علماء اس وقت بھی تھے، ویسے شیطان کیا کم عالم ہے۔ اسے تو معلم الملکوت کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن عالم باعمل کی کمی تھی اور شاید اس کمی کو پورا کرنے کے لئے قدرت نے اسی بجھتی ہوئی آگ سے ایک شرر پیدا کر دیا۔

جب مولانا اسماعیل سن رشد کو پہنچے اور زمانے کے حال پر نظر ڈالی تو ان کے دل میں اسلامی حمیت اور جوش و جذبہ نے سر اٹھایا، وہ اُٹھے اور یکا و تنہا لوگوں کو سمجھانے لگے، گمراہیوں کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے عوام کو قرآن و حدیث پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی، قبر پرستی سے روکنا۔ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ مگر اسماعیل دھن کے پکے تھے انھیں تو مسلمانوں میں اسلاف کا تابِ جگر پیدا کرنے کی لو لگی ہوئی تھی، امت محمدی کو اسلامی نشاۃِ ثانیہ سے ہمکنار کرنے کے لئے اسمٰعیل شہید نے کمر باندھی اور لگاتار کوشش کے بعد انھوں نے عوام کو اپنے ساتھ کر لیا۔ قدرت نے زبان میں وہ جادو بھر دیا تھا کہ مخالفین بھی سر دُھنتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی سطوت کی نہ صرف شمع گل ہوئی بلکہ وہ

سب کچھ ہوگیا جو اپنے شدائد و عواقب کے اعتبار سے اندلس، بغداد، قسطنطینیہ کے زوال سے بھی سنگین تر تھا اور یہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا بلکہ خون کے آنسوؤں میں اسی کی داستان پنہاں ہے۔ بربادی اور حسرتوں کی انتہا ہی نہ تھی بلکہ اس کا انجام اس سے بھی زیادہ تاریک اور مایوس کن تھا مسلمانوں کے ضعف نے انگریزوں کو ان پر مسلط کر دیا اور اب ان کی قسمت صرف اسی حکومت کے ہاتھ میں نہ تھی بلکہ ان کا مقابلہ ہندوستان کی ان دوسری قوموں سے بھی تھا جو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں سے بیزار تھیں، ان میں سکھ قوم پیش پیش تھی رنجیت سنگھ کی کینہ پروری اور ہوس ملک گیری نے اسے اندھا کر دیا تھا اس نے سارے پنجاب پر قبضہ کرلیا اور اس کے کارندوں نے مسلمانوں کو طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کیا۔ ان کی مسجدوں میں جانور باندھے، ان کے بیوی بچوں کو قتل کیا۔ اذان دینے کی ممانعت کردی، سور و شراب زبردستی کھلایا پلایا، لاکھوں مسلمان تنگ آکر گھر بار چھوڑ چکے تھے، اسمٰعیل شہید جیسا سنت محمدی کو زندہ کرنے والا امت محمدی کی مظلومی پر کیسے چپ رہتا؟ سارے پنجاب کا دورہ کیا، بھیس بدل کر واقعات کا پتہ چلایا۔ جب سکھوں کی کوتاہ اندیشی، ظلم و تعدی اور کبر و نخوت کا تجربہ ہوگیا تو مولوی اسمٰعیل شہید ان طاغوتی قوتوں کے مقابل سینہ سپر ہوگئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ایک سے زیادہ غنیموں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اپنے ہی گھر میں دشمنوں سے گھرے ہوئے مسلمانوں کو بچانے کا بیڑہ اٹھایا۔ مولوی

سید احمد بریلوی کو اپنا ہم خیال بنایا، ان دونوں بزرگوں نے مل کر تمام شہروں کا دورہ کیا اور مجاہدوں کی جماعت بنائی، لوگوں سے قسمیں لیں اور سرفروشوں کا لشکر تیار کر کے سکھوں سے جنگ کرنے پر تل گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان درماندہ تھے، ان کو اپنے آپ پر اعتماد تھا اور نہ اس نصب العین پر یقین تھا جس کے ساتھ وہ علم بردار رہ چکے ہیں نتیجہ یہ کہ اب قوتِ بازو اور قوتِ ایمانی دونوں سے محروم تھے ایسے میں توحید اور عشق الٰہی کا جذبہ پیدا کرنا آسان نہیں، مادی وسائل اور اسباب کی فراہمی مشکل نہیں تھی لیکن ذہنی انقلاب سے ہم آہنگ اور متوازن ہونا دشوار تھا ان تمام امور پر نظر رکھ کر اسمٰعیل شہید نے مجاہد تحریک کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں کے لئے حیات نو کی بساط بچھائی۔

ان دونوں بزرگوں نے سکھوں سے مسلسل گیارہ جنگیں لڑیں اور سکھوں کو ناکوں چنے چبوائے، ان کے تین چوتھائی ملک پر قبضہ کر لیا لیکن آخر میں اپنے ساتھیوں کی لغزشوں کی وجہ سے ناکام ہو کر سکھوں کے ہاتھوں جام شہادت پینا پڑا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!

یہ گروہ اتنا قوی اور با اثر تھا کہ ان کی شہادت کے بعد ہندوستان کے ہر شہر میں ان کے پیرو کثیر تعداد میں موجود تھے، حلوے مانڈے اور

نام و نمود کے مولویوں نے جو قوم کے بھولے بھالے انسانوں کو فریب دے کر اپنا پیٹ بھرنا ہی نصب العین بنائے ہوئے تھے ان لوگوں کو "وہابیوں" کے نام سے مشہور کر دیا اور یہ وہابی تحریک سارے ہندوستان میں زور پکڑتی چلی گئی۔

ادھر سرکار انگریزی کو سکھوں اور مخالف اسلامی قوتوں نے بھڑکایا اصل میں اس تحریک کا مقصد اسلامی نشاۃ ثانیہ تھا، اسلام کے حقیقی جذبے اور عقیدے کو پھر سے زندہ کر کے توحید کا پرچم بلند کرنا تھا اور اور اسی کوشش میں مسلمان اپنی تنظیم میں مصروف تھے۔ انگریزی حکومت ان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے لرزہ براندام تھی۔ اس کی دسیسہ کاری نے رنگ لایا اور وہ انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ایک انگریز نے تو ہندوستانی مسلمانوں کے حال پر اس قدر کرم کیا کہ ان کی صورت و شکل ہی بدل ڈالی۔ ہنٹر صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے نام سے جو کتاب لکھی وہ سراسر فتنہ پردازی اور کمینگی کی دلیل ہے۔ اس میں تو اس نے "وہابی" اور "باغی" کے ایک ہی معنی بتائے ہیں۔ ایک فاضل اور مدبر انگریز کی رائے سے انگریزی حکومت کیسے مستفید نہ ہوتی کہ مسلمان سکھوں سے برسرپیکار تھے اور انگریز نقص امن سے بوکھلائے ہوئے تھے مگر یہ خدا کے پرستار اور عاشق رسول کسی سے دبنے والے تھوڑی تھے، وہ برابر طاغوتی قوتوں کو سرنگوں کرتے جا رہے تھے۔ ہندوستان کے تمام شہروں سے ان مجاہدین کو امداد پہنچائی جا رہی تھی۔ انگریز تاک میں

لگے ہوئے تھے کہ آخر ان " باغیوں " کو مدد کہاں سے ملتی ہے؟ فرنگیوں کی عیاریوں اور رشوتوں نے رنگ دیا اور انھوں نے دینداروں کی پگڑی اچھالنا شروع کی مسلمانوں کے لئے دل کی انتہائی گہرائیوں میں درد رکھنے والے انگریزوں کے بہیمانہ ظلم کا شکار ہو گئے۔ بعض بدنیتوں اور کافروں نے مخبری کر دی کہ محمد جعفر تھانیسر کا رئیس ان کی خفیہ مدد کرتا ہے۔ بس اتنا معلوم ہونا تھا کہ انگریز ان پر پل پڑے، انگریزی راج نے کب انصاف و دیانت سے کام لیا تھا۔ آمریت کے آگے اس نے ہمیشہ حق و صداقت کا خون کیا۔ آناً فاناً مولانا محمد جعفر کے گھر کی تلاشی اور گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ گو ان کے خیر خواہوں نے وقت سے پہلے مطلع کر دینا چاہا لیکن قدرت بھی تو ان کو آزمانا چاہتی تھی، اتنے بڑے مجاہد کی آزمائش بھی کڑی ہونی تھی، قدرت نے خیر خواہوں کو بدخواہوں سے پیچھے رکھ دیا اور مولانا انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے۔

اب انگریزی فتنہ سامانی نے انھیں آتشیں حلقے میں دھکیل دیا، زر و جواہر کی لالچ دی، لیکن ایمان کا نور اور عشق الٰہی کا شعلہ پوری طرح چمک رہا تھا۔ مسیحی غمزہ ایسے مجاہد جاں فروش کو کیا خاک شکار کر سکتا تھا۔ فرنگیوں نے اپنے ترکش کو خالی کر دیا زہر اور محبت دونوں سے کام لیا۔ لیکن عاشقِ رسول اور قوم کا فدائی ہر صعوبت کو خدا کی طرف سے سمجھ کر مسکراتا ہوا جھیل گیا۔ اس کے

عزم وثبات اور استقلال میں ذرا لغزش نہ آئی، رحمت باری کے انتظار میں سارے زہر کو ایک جواں مرد کی طرح پی گیا۔ اس کے ایمان و ایقان کی صداقت رنگ لائی، رحمت جوش میں آئی اور اُسے آگ و خون میں بھی گلزارِ ابراہیم کا منظر دکھایا۔ سچ ہے قدرت انتقام لینے والے سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اس نے اپنے چاہنے والے کی صعوبتوں کو راحتوں سے تبدیل کر دیا۔ کانٹوں کو پھولوں کی سیج بنا دیا یہی ایک مسلمان کا ایمان ہے۔ مجاہد کا استقلال ہے "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ" پر عمل کرنے والے کو سرفرازی اور سربلندی ضرور ملتی ہے۔ لیکن مدعی کی آزمائش کے بعد ؎

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

زیر نظر کتاب اسی مجاہد کی خود نوشت سوانح ہے۔ تقریباً سو سال پہلے کے واقعات ہیں۔ زبان پرانی اور کچھ نامانوس ہے لیکن ہمیں زبان کے چٹخاروں اور ادب کی چاشنی سے زیادہ اس کے اندر چھپی ہوئی اس اصل اسپرٹ کو دیکھنا چاہیئے جو ایک مجاہد کے جذبۂ ایثار و قربانی اور جوش عمل کی غماز ہے۔ اگر آج بھی ہمارے اندر یہ استقلال، یہ ایمان اور یہ ایثار پیدا ہو جائے تو ہم دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ زندگی پُرآشوب تصور کرنا اور مایوس و محزون ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے اندر توحید کا جذبہ نہیں ہے خود اعتمادی کا اصل راز عقیدۂ توحید میں مضمر ہے۔

شاہین فاروقی

اِبتدائے عشق

اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ سرحد غربی ہند پر ملک یاغستان میں خود سرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اِس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلے کی گھاٹی میں جاکر فوج سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ بیگانے ملک میں سرکار کی مداخلت بیجا کے سبب سے ملاں عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مُریدوں کو ساتھ لے کر آموجود ہوئے ملکی خوانین اور افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے معتا ملہ سرکار پر ٹوٹ پڑے۔ قافلۂ مجاہدین جن کی سرکوبی اور نیست و نابود کرنے کو ہماری سرکار چڑھی تھی الگ رہ گیا مگر بدعویٰ حفاظت خود اختیاری ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہوگیا۔ مجاہدوں نے بھی بہ تمنائے حصولِ شہادت دادِ شجاعت دے کر اپنے جوہر دکھلائے۔ غرض دو تین مہینے تک خوب جنگ

ہوتی رہی - خود جنرل چیمبرلین صاحب مجروح شدید ہوئے۔ تقریب سات ہزار کے کشت و خون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں سے فوج کھینچکر سرحد پر بھیجی گئی -

اُدھر یہ گرما گرمی تھی - اِدھر لارڈ ایلجن صاحب وایسرائے ہند چمبے کے پہاڑ پر اپنی اِس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر یک بیک مر گئے۔ ہندوستان بے گور نر ہو گیا۔ ایسے نازک وقت میں ۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۲۸ جمادی الآخر ۱۲۸۰ ہجری کو ایک سوار پولیس متعینہ چوکی پانی پت ضلع کرنال مسمی غزن خاں نام ایک ولایتی افغان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہو کر اور ایسے وقت میں اپنی دینوی بھلائی کا موقع جان کر ایک بڑی لمبی چوڑی اور جھوٹی کیفیت خیرخواہانہ کے ساتھ بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدوں کے ساتھ سرحد پر ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔ خیر۔ ڈپٹی کمشنر کرنال نے یہ داستان سن کر بذریعہ تار برقی ضلع انبالہ کو جس کی حدود اراضی کے اندر ہمارا شہر تھانیسر واقع ہے خبر بھیجدی۔ ادھر مخبر مخبری کر کے باہر نکلا تھا کہ اُدھر ہمارے ایک دوست ڈپٹی کمشنر صاحب کرنال کی ملاقات کو اُن کے بنگلے پر پہنچے۔ جن سے عند التذکرہ صاحب موصوف نے ذکر اس مخبری کا بھی کیا۔ جب بعد انفراغ ملاقات کے یہ صاحب ہمارے دوست

اپنے ڈیرے کو تشریف لائے تو انھوں نے مسمی کا دا ایک اپنے نوکر سے جو میرا ہمسایہ تھا بطور افسوس حال اس مخبری کا بیان کیا۔ تب کادا نوکر یہ حال سُن کر اُسی وقت اس کی خبر کرنے کو تھانیسر دوڑ پڑا لیکن خوبی تقدیر سے کچھ زیادہ رات گئی یہ شخص تھانیسر میں پہنچا اور سب سے پہلے میرے مکان پر آیا۔ مگر میں اس وقت گھر کے اندر جا کر سو رہا تھا۔ وہ اس وقت رات کو ہمارا دروازہ بند اور ہم کو سوتے دیکھ کر ایسے آرام کے وقت میں ہم کو تکلیف دینا مناسب نہ جان کر اپنے دل میں سوچا کہ فجر کو خبر کر دونگا۔ ادھر تقدیر اس کو دروازے پر سے ہٹا لے گئی۔ اب ادھر انبالہ کی کیفیت سنیئے۔ جب انبالہ میں یہ تار کی خبر پہنچی تو ایک وارنٹ میری خانہ تلاشی کا جاری ہوا۔ اور کپتان پارسن صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک جماعت کثیر پولیس کی ساتھ لے کر راتوں رات میرے مکان پر پہنچے۔ یہاں قدرت الہٰی کا تماشہ دیکھئے۔ ایک ہی وقت میں دو آدمی ایک کرنال سے مجھ کو خبر دینے کو اور دوسرا انبالہ سے میری خانہ تلاشی کو روانہ ہوئے۔ کرنال والا جو میرا خیر خواہ تھا۔ پہلے پہنچا اور کچھ نہ کر سکا ؎

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزن تدبیر گر ساری عمر سیتی رہے

مگر یہ دوسرے صاحب بوقت تین بجے رات میرے گھر پر پہنچ گئے پہلے چاروں طرف سے میرے مکان کو گھیر لیا۔ اور پھر مجھ کو باہر بلایا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا

کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس معہ وارنٹ خانہ تلاشی کے میرے دروازہ پر موجود ہیں۔ اُنھوں نے اوّل مجھ کو وارنٹ دکھلایا بعدہٗ کہا۔ کہ آپ اپنے مکان کی تلاشی دو۔ اُس وقت میں سمجھا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ تب میں نے چاہا کہ اوّل تلاشی میرے گھر کے اندر کی ہو تو بہتر ہے تاکہ بیٹھک میں جو بلا کا بھرا ہوا خط رکھا ہے کسی طرح پولیس کے ہاتھ نہ آوے لیکن ہونی کون روک سکتا ہے۔ باوجودیکہ صدر دروازے سے اندر داخل ہو کر میری ڈیوڑھی میں سراسر اندھیرا تھا۔ اور مکان کی بیٹھک جو اِس ڈیوڑھی کے جانب شمال تھا۔ اُس کا دروازہ اِس اندھیرے میں بالکل معلوم نہ ہوتا تھا۔ تو بھی سپرنٹنڈنٹ صاحب اِسی بات پر مصر ہوئے کہ پہلے بیٹھک ہی کی تلاشی کی جاوے۔ اس وقت بیٹھک میں جانے کے واسطے دو دروازوں کا کھلوانا ضرور ہوا جو اندر سے بند تھے۔ میں نے چالاکی سے منشی عبدالغفور کا نام (جو اس کے اندر معہ اور چند آدمیوں کے سوتے تھے) پکار کر باآوازِ بلند کہا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب تلاشی کے واسطے کھڑے ہیں۔ تم جلد دروازہ کھول دو اور اس کہنے سے میری یہ غرض تھی کہ کسی طرح وہ لوگ تلاشی کی بات سمجھ کر دروازہ کھولنے سے پہلے اس زہریلے خط کو چاک کر دیویں۔ اِس میری پکار کو صاحب سپرنٹنڈنٹ سمجھ کر مجھ کو مانع بھی ہوئے۔ مگر میں کہاں سنتا تھا۔ لیکن تقدیر پھاڑنے دیوے تو پھاڑا جاوے۔ اندر والوں نے مارے گھبراہٹ کے میرے اشاروں کو کچھ نہیں سمجھا اور دروازہ کھول دیا۔ اب بیٹھک میں تلاشی ہونے لگی۔ اور وہی خط جس کا ذکر تھا۔ سب سے پہلے پولیس کے ہاتھ میں آیا۔ اور اِسی شام کو اس تلاشی سے فقط چھ گھنٹے

پہلے تقدیر نے وہ خط میرے ہاتھ سے لکھوا رکھا تھا۔ وہ خط امیر قافلہ کے نام تھا۔ اور اس میں اصطلاحی لفظوں میں چند ہزار اشرفیوں کی روانگی کا ذکر تھا۔ اس کے سوا اور بھی چند خطوط پارینہ آمدہ پٹنہ و مرسلہ محمد شفیع انبالہ پولیس کے ہاتھ لگ گئے۔ گو ان خطوں میں کوئی ایسا مضمون مضر نہ تھا۔ مگر ان سے پولیس کو یہ پتہ مل گیا کہ محمد شفیع انبالوی اور اہل پٹنہ کی تلاشی اور تفتیش بھی ضرور کرنی چاہیئے۔ منشی عبدالغفور باشندہ ضلع گیا ملک بہار جو میرے یہاں محرّری کا کام کرتے تھے۔ اور عباس نام ایک بنگالی لڑکے کو بھی جو میری بیٹھک میں سوتے ہوئے ملے تھے۔ پولیس پکڑ کر لے گئی گو میری نسبت بھی پولیس کو شک قوی ہو گیا تھا۔ لیکن بوجہ نہ ہونے وارنٹ گرفتاری کے اور بلا حصول منظوری گورنمنٹ کے جو ایسے مقدمات میں ہونا ضروری ہے اہل پولیس مجھ سے اس دم کچھ مزاحم نہ ہوئے۔

فرار جب پولیس میرے گھر سے چلی گئی تو یہ بات غور طلب ٹھیری کہ اس وقت مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے بخیال اس شہادت وثبوت کے جو ان کو میرے گھر سے مل گئے تھے اور اس غصّہ کے وقت کو جو تازہ جنگ سرحد سے سرکار پر چڑھا ہوا تھا، ٹال دینے کی غرض سے اس وقت اپنا فرار ہوجانا۔ اور اس نامردی سے جان بچانا مناسب جانا۔ گو میں پولیس کی حراست میں نہ تھا۔ مگر انہوں نے چاروں طرف میرا سراغ لگائے ہوئے تھے۔ اور میری حرکات کو تاک رہے تھے۔ میں نے اپنی والدہ ماجدہ سے جو اس وقت زندہ موجود تھیں اور

اپنی بیوی سے صلاح لے کر اور اُن کو اپنے فرار پر راضی پاکر یہ داؤ کھیلا کہ میں ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنے شہر سے روانہ ہو کر اوّل موضع پیپلی میں جہاں تحصیل اور تھانہ وغیرہ ہے آیا۔ اور وہاں ملازمانِ تحصیل اور پولیس سے رائے لی کہ اب مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ سب نے باتفاق یہ رائے دی کہ تم انبالہ کو جاؤ۔ اور وہاں سے دریافت کرو کہ یہ کیا مقدمہ ہے۔ اور کس نے یہ مخبری کی ہے۔ غرض یہ سب صلاح اور مشورہ ظاہری ان سب سے کر کے میں بوقتِ شام براہِ سڑک کلاں پیپلی سے انبالہ کو روانہ ہوا۔ اُس وقت بہت سے آدمی چشمِ محبت اور افسوس سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جب میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلا ہر کسی کو یقین ہو گیا کہ میں انبالہ کو جاتا ہوں۔ جب تک دن کی روشنی تھی میں برابر سڑک سڑک انبالہ کو چلا گیا۔ کوئی ایک میل بھر راستہ چلنے کے بعد خوب تاریکی ہو گئی۔ اور مسافر بھی دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ اُس وقت میں سڑک انبالہ کو چھوڑ کر جنگل کی راہ سے ایک جگہ مقررہ پر اپنی زمینداری کی زمین میں تھانیسر کے متصل قریب ایک بجے رات کے پہنچ گیا۔ جب میں وہاں پہنچا میں نے دیکھا کہ میری والدہ اور بیوی بچے اور میرا بھائی محمد سعید وغیرہ میری آخری ملاقات کے واسطے وہاں حاضر ہیں۔ غرضا میں اپنی والدہ سے آخری ملاقات کر کے اور اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر بسواری ایک عمدہ بہلی کے صبح ہوتے ہی ۲۲ کوس پانی پت پہنچا۔ میں پانی پت شہر کے اندر نہیں گیا۔ سڑک پر سے اپنے بیوی بچوں کو رخصت کر دیا۔ اُس وقت میں جس کسی سے رخصت ہوتا تھا مجھ کو

اس زندگی میں اُس سے دوبارہ ملنے کی اُمید نہ تھی۔ اس بہلی گڈ والے سے میں نے
کہدیا تھا کہ میری بیوی بچوں کو پانی پت میں چھوڑ کر تم معہ بہلی جمنا پار چلے جانا۔ یہ بہلی معہ
جوڑی بیلوں کے جو تین سو روپے سے کم قیمت کے نہیں ہیں۔ ہم نے تم کو اس
شرط پر بخشش دی کہ تم کسی شخص کو ہمارے بال بچوں کا پتہ نشان نہ دینا۔ اور جب
تک یہ معرکہ گرم رہے۔ تھانیسر کو نہ جانا۔ جس وقت ڈاک خانہ پانی پت کے سامنے
میں ساری عمر کے واسطے اپنی بیوی اور بچوں سے جُدا ہوا۔ اور میرا یکہ اُن کے
سامنے دہلی کو چلا۔ وہ حادثہ قابلِ تحریر نہیں ہے۔ خیر وہاں سے بسواری یکہ دوسرے
دن چالیس کوس دہلی میں پہنچ گیا۔ اور وہاں میاں نصیر الدین سوداگر کی کوٹھی میں
ٹھیرا۔ جہاں میاں حسینی ساکن تھانیسر اور حسینی ساکن پٹنہ اور عبداللہ نام ایک بنگالی
سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں آدمی آخر الذکر پٹنہ سے کچھ اشرفیاں لے کر اسی
دن آئے تھے۔ میں نے وہ اشرفیاں اُن سے لے کر حسینی ساکن تھانیسر کے حوالہ
کر کے اس کو ہدایت کر دی کہ جیسے ممکن ہو اس بیت المال کو قافلہ تک پہنچا دو۔ بعد
روانہ کرنے حسینی تھانیسر کے میں نے ان ہر دو آزندۂ زر کو اپنے ساتھ پورب
کو واپس لیجانا چاہا۔ کیونکہ بوجہ و پیشی معرکہ انبیلا اور میری خانہ تلاشی
کے ملک پنجاب میں امن نہ رہا تھا۔ اور اُن ایام میں میری عمر قریب پچیس برس
کی تھی اور جوش مذہبی بھرا ہوا تھا۔ نشیب و فراز زمانہ کا کچھ خیال نہ تھا۔ یہ دل
میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ خدا کا کام ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ اس سبب سے

اُس وقت تک میرے دل میں یہ خیال تھا کہ اس داؤ کے سبب سے اِس طرف میری تلاش کو کوئی نہ آئے گا۔ میری تلاش انبالہ اور اُس کے مغرب میں ہو گی۔ اِس خیالی حکمت پر دہلی پہنچکر میں نے اپنے مخفی رکھنے کے واسطے کوئی احتیاط نہ کی۔ میں خود اپنے معمولی لباس میں ایک شکرام کرایہ کرنے کو چاندنی چوک تک گیا۔ اور پھر پندرھویں دسمبر کو کھلم کھلا ہم تینوں آدمی بسواری شکرم علی گڑھ کو روانہ ہو گئے۔ راہ میں گاڑی ہانکنے والوں کو بہت سا انعام اکرام دے کر چاہا کہ کسی طرح جلدی سے علی گڈھ پہنچکر ریل پر سوار ہو جاؤں۔ کیونکہ اس وقت تک یہ خیال تھا کہ میں ایسی چال سے آیا ہوں کہ شاید مدت تک میری تلاش کو کوئی اِس طرف کو نہ آویگا۔ میں اپنی خام خیالی سے اپنی تدبیر پر ایسا نازاں تھا کہ تقدیر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اب مجھ کو یہیں چھوڑکر پولیس انبالہ کی کارروائی کو سُنیئے:-

بارھویں دسمبر کو جب سپرنٹنڈنٹ پولیس میرے خطوط اور آدمیوں کو جو میرے گھر سے ملے تھے انبالہ کو لے گئے۔ تو اُن کو دیکھ کر بعد حصول منظوری گورنمنٹ میری گرفتاری کا وارنٹ لے کر تھانیسر آیا۔ اور مجھ کو وہاں نہ پاکر شہر میں آفت مچا دی۔ سینکڑوں گھروں کی تلاشی ہوئی۔ پچاسوں مرد عورت پکڑے گئے میری بوڑھی والدہ اور میرے بھائی محمد سعید کو جو اس وقت صرف بارہ تیرہ برس کا تھا۔ اور اُس کی بیوی کو قید کر کے اُن پر سخت عذاب اور مارپیٹ شروع کی۔ اور ایسا ظلم اور بے عزتی عورات پردہ نشین کی ہوئی کہ جس کو سُنکر دل کانپ جاتا ہے۔

میری بیوی کے کپڑے کو بھی ایک دوڑ پانی پت کو گئی۔ مگر مولوی رضی الاسلام صاحب کی جوانمرد والدہ کی دلیری سے میری عورت بچ گئی۔ خیر ان ما رکھانے والوں میں ایک میرا بھائی محمد سعید نہایت کم سن اور لذت ایمانی اور فضائل ثابت قدمی سے سراسر بے بہرہ تھا۔ اس سخت مار پیٹ کو نہ اٹھا سکا اور ڈر گیا۔ اور اپنی جان بچانے کے واسطے بول اٹھا کہ میرا بھائی دہلی کو گیا ہے۔ یہ خود میری غلطی تھی کہ ایسے اہم راز پہ ایک نا بالغ بچہ کو آگاہ کر دیا تھا جس کا نتیجہ میری گرفتاری ہوئی۔ اسی وقت پارسن صاحب میرے بھائی کو ساتھ لے کر بسواری ڈاک دہلی پہنچے۔ ادھر پنجاب میں جابجا میری تلاشی شروع ہوئی۔ دس ہزار روپیہ کا اشتہار میری گرفتاری کے واسطے جاری ہوا۔ کیمپ انبالہ میں محمد شفیع کے مکان میں بھی تلاشی ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت محمد شفیع لاہور میں موجود تھے۔ یہاں ان کے بھائی محمد رفیع اور مولوی محمد تقی و منشی عبد الکریم ان کے کارندے گرفتار کئے گئے۔ اور ان کو ڈرایا گیا کہ اگر تم سب حال نہ بتلاؤ گے تو تم کو پھانسی دی جائے گی۔ جان کے ڈر سے محمد رفیع حقیقی بھائی محمد شفیع کے اور مولوی محمد تقی صاحب بڑے پرانے کارندے اور واعظ جامع مسجد محمد شفیع پر گواہ ہو گئے۔ اور جو پولیس نے ان کو سکھلایا سو گواہی دے کر اپنی جان بچائی۔ اور منشی عبد الکریم جنھوں نے حسب تعلیم پولیس گواہی نہ دی تھی بلا قصور محمد شفیع کے ساتھ دائم الحبس ہو گئے۔ ادھر پارسن صاحب نے دہلی میں پہنچ کر آفت مچا دی۔ سراؤں اور شہر کے دروازے

بند کر دیئے۔ ہزاروں آدمیوں کی تلاشی ہوئی۔ پچاسوں آدمی پکڑے گئے۔ اسی پکڑ دھکڑ میں پارسن صاحب کو یہ پتہ مل گیا کہ میں فلاں شکرم میں سوار ہو کر فلاں وقت معہ دو دوسرے آدمیوں کے علی گڈھ کو گیا ہوں تب اُسی دم بذریعہ تار برقی میری گرفتاری کے واسطے علی گڈھ کو خبر دی گئی۔

گرفتاری خوبیٔ تقدیر سے علی گڈھ میں جو میرے گھر سے قریب دو سو میل کے ہے۔ عین میرے وہاں پہنچنے کے وقت یہ خبر تار پہنچی تو اُسی وقت۔ برلب سڑک پولیس نے آ کے ہم کو گھیر لیا۔ اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ علی گڈھ کے بنگلے پر لے گئے۔ اس نے ہم کو مجسٹریٹ صاحب کے پاس بھیجدیا۔ جہاں سے میں اور میرے دونوں ہمراہی تا آنے جواب تار کے حوالات میں رکھے گئے۔ اُسی دن شام کو جب میں تیمم کر کے نماز پڑھ رہا تھا۔ پارسن صاحب وہاں پہنچ گئے۔ اور مجھ کو قید میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور حکم دیا کہ اس کو پھانسی گھر میں بڑی حفاظت کے ساتھ بند کر دو۔ اسی دم میں ایک بڑی کوٹھڑی تنگ و تاریک میں بند کیا گیا۔ اور دو تین پہرے اس کے گرد مقرر کر دیئے گئے۔

اب پھانسی گھر میں بند ہو کر مجھ کو عقل آئی کہ یہ فرار اور فخر تدبیر خداوند تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تھا۔ اور پھر میں آخر تک دیکھتا رہا کہ اسی فرار سے یہ مقدمہ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ اور جو تکالیف مجھ کو یا میرے عزیزوں اور دوستوں کو پہنچی وہ سب۔ اسی فرار نابکار کا ثمرہ تھا۔ عاشقی کر کے جانچ کے وقت میدان سے

بھاگ جانا صادقوں کا کام نہیں ہے۔ بقول حافظ؎

بیگانہ راچہ کار بود در بلائے غم
آنرا رسد کہ خاص بود آشنائے ما

جب بوقتِ شب بمقام علی گڈھ مجھ کو پہرہ والوں نے پوچھا کہ پھانسی والے مجرم پر بھی صرف ایک پہرہ ہوتا ہے تم ایسا کیا قصور کر کے آئے ہو کہ جس سے تم پر تین پہرے لگائے گئے۔ میں نے کہا کہ میں جس شخص کا غلام تھا اُسی کے حکم سے بھاگ آیا ہوں۔ اِس واسطے وہ غصہ ہے اور مجھ کو راہ سے پکڑوالیا۔

سب سے پہلے جیل کا کھانا مجھکو اس جیل میں ملا۔ دو روٹی اور تھوڑا سا ساگ میرے حوالہ کیا گیا۔ ساگ میں تو سوائے موٹے موٹے ڈنٹھلوں کے پتی کا نام نہ تھا۔ جن کا چبانا بھی دشوار تھا۔ روٹیوں میں قریب چوتھائی کے باو اور مٹی ملی تھی۔ خیر! خدا کا شکر کر کے تھوڑا بہت اُس میں سے کھایا۔ پھر اُس کے بعد اکثر جیلخانوں میں میں نے وقتاً فوقتاً رہ کر دیکھا۔ تو سب جگہ قیدیوں کا کھانا ویسا ہی پایا۔ کیونکہ قیدیوں کو در اصل خوراک کم ملتی ہے۔ جس سے اُن کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اور جب اُن کو گیہوں پیسنے کے واسطے دی جاتی ہے تو وہ مارے بھوک کے سیروں گیہوں چبا جاتے ہیں یا کچا آٹا پانی میں گھول کر پی لیتے ہیں اور آٹے کا وزن پورا کرنے کے واسطے آٹے میں مٹی یا بالو ملا دیتے ہیں۔ اور اسی طرح جو عمدہ ترکاری جیل کے باغوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اُس کو تو فروخت

کر دیتے ہیں۔ یا جیل کے عہدہ دار رکھا جاتے ہیں ناکارے ڈھنٹھل جن کو جانور بھی نہ کھا دیں۔ گنڈاسوں سے کاٹ کاٹ کر قیدیوں کے واسطے پکا دیتے ہیں وہ بھوکے اُسی کو غنیمت جان کر ہاتھوں ہاتھ اڑا جاتے ہیں۔ گو نو آمد قیدیوں کو دو ایک دن اُس کے کھانے میں ایذا ہوتی ہے۔ مگر جب عذاب الجوع اُن پر مسلط ہوتا ہے۔ تو پلاؤ قورمے سے بھی زیادہ اُس میں مزہ پاتے ہیں اور کھا جاتے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں اصل مزہ بھوک کا ہے۔

اِمتحانِ عشق دوسرے دن پارسن صاحب ہم تینوں آدمیوں کو ساتھ لے کر خوشی خوشی بسواری ٹمٹم دہلی کو روانہ ہوا ٹمٹم پر سوار کرنے سے پہلے مجھ کو بیڑی، ہتھ کڑی، طوق پہنا کر اور طوق میں بطور باگ ڈورا ایک اور زنجیر ڈال کر اور اس کا سرا ایک مسلح سپاہی پولیس کے ہاتھوں میں دے کر اُس کو میرے پیچھے بٹھایا۔ اور پارسن صاحب اور ایک دوسرا انسپکٹر پولیس میرے دہنے بائیں بھرے ہوئے طپنچوں کی جوڑیاں لے کر اور میرے بدن سے بدن ملا کر بیٹھ گئے۔ اس کے سوا پارسن صاحب بار بار مجھ کو راہ میں کہتا ہوا آتا تھا کہ اگر تم ذرا بھی حرکت کروگے تو میں اس طپنچے سے تم کو مار دوں گا۔ علی گڈھ سے چل کر دہلی تک کھانا پینا تو درکنار کسی سخت ضروری حاجت کے واسطے بھی ہم نہ اُتارے گئے۔ جب نماز کا وقت آتا تھا تو میں بلا طلب واجازت تیمم کر کے بیٹھے بیٹھے اشاروں سے نماز پڑھ لیتا تھا۔ اور گاڑی بدستور چلی جاتی تھی

اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ آخر بصد مصیبت اس حال سے لوہے میں جکڑے ہوئے ہم دہلی میں داخل ہوئے۔ جہاں لیجا کر زیر بنگلہ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے ہم کو ایک تہ خانہ میں زندہ درگور بند کر دیا۔ دوسرے دن دہلی سے کرنال اور پھر کرنال سے انبالہ ہم کو لے گئے۔ جب ہم انبالہ میں پہنچے۔ بہت رات جا چکی تھی۔ اسی طرح بے آب و دانہ ہم تینوں آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا۔ جہاں ہم شروع اپریل تک برابر بند رہے دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ اور میجر ونکیفل صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور کپتان ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ یاجوج ماجوج کے میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتلا دو۔ تمہارے واسطے بہت بہتر ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا۔ اور پھر مارنا شروع کر دیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور گر پڑا تو ٹائی صاحب اور ونکیفل صاحب کوٹھڑی کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا۔ تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم اور تعدی کی دیکھی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ کچھ رمضان کے روزے باقی تھے۔ دوسرے دن سے میں نے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔

دوسرے دن جب میں روزے سے تھا علی الصباح پارسن صاحب پھر

آیا۔ اور وہی کارروائی شروع کی۔ مگر تھوڑی زدوکوب کے بعد مجھ کو اپنی بگھی میں بٹھلا کر ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا۔ جہاں پر وہ دونوں صاحب یعنی ٹائی صاحب اور میجر ونکفیل صاحب بھی موجود تھے۔ اُس دن اُنھوں نے میری بڑی چاپلوسی کی۔ اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں۔ کہ اگر تم دوسرے شرکاء اور معاونین جہاد کو بتلا دو۔ تو تم کو سرکاری گواہ کرکے رہا کر دینے کے سوا بڑا عہدہ بھی دلویں گے۔ اور بصورت نہ بتلانے کے تم کو پھانسی ہوگی۔ میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا۔ تو پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کرکے مجھ کو ایک الگ کمرے میں لے گیا۔ جہاں لیجا کر پھر مارنا شروع کیا۔ آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مارپیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن بفضل الٰہی میں ۔۔ سہ گیا۔ مگر اپنے رب سے ہر دم یہ دُعا کرتا جاتا تھا۔ کہ اے رب! یہی وقت امتحان کا ہے۔ تو مجھ کو اس وقت ثابت قدم رکھیو۔ جب وہ ہر طرح مایوس ہوگئے تو لاچار بعد آٹھ بجے رات کے مجھ کو جیل خانہ کو واپس بھیج دیا۔ میں تمام دن روزے سے تھا۔ بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار کر لیا اور جیل میں پہنچکر جو میرے حصہ کا کھانا رکھا تھا اس کو کھا کر اور شکر الٰہی کرکے سو رہا جس دن میں ٹائی صاحب کے بنگلہ پر اس مارپیٹ کی لذت بنگلہ کے اندر اُٹھا رہا تھا اُس وقت منشی حمید علی صاحب تھان پوری تحصیل دار نرائن گڈھ صرف اس قصور پر کہ اس نے میری گرفتاری سے چند برس پہلے اپنے کسی دنیوی معاملہ میں مجھ کو

ایک خط لکھا تھا۔ اور بعض عملہ کچہری نے جو اُس کے دشمن تھے اِس خط کے معنے غلط بیان کر دیئے تھے جس پر وہ غریب معزز عہدہ دار معطل ہوکر باہر برآمدہ میں غمگین بیٹھا تھا۔ میں اس کا غمگین چہرہ دیکھ کر اپنی تکلیف بھول گیا۔ اور یہ خیال دل میں آیا۔ کہ مجھ منحوس نالایق کو فقط ایک خط لکھنے پر یہ بیچارہ بے گناہ بھی پکڑا گیا اگر اس کے بدلے بھی مجھ کو ہی سزا ہو جائے۔ اور یہ رہا ہو جائے، تو بہت بہتر ہے۔ میں اپنی اِس حالتِ زار میں اس کے واسطے بہت دعا کرتا۔ فضلِ الٰہی سے وہ ناکردہ گناہ آخر بری ہو کر پھر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا اور اَب تک اوّل درجہ کا عہدیدار ملک پنجاب میں ہے۔ اِس تاریخ کے بعد مجھ کو پھر کبھی گواہ شاہد ہونے کی ترغیب نہیں دی گئی۔

گواہ گردی جب میری طرف سے قطعی مایوسی ہو گئی۔ تو محمد رفیع اور مولوی محمد تقی کو جو میری طرح سے قید میں تھے مخبر بنا کر رہا کر دیا گیا۔ انہیں کے بیان سے بیچارہ محمد شفیع جس کو اس مقدمہ سے بہت ہی تھوڑا تعلق تھا، لاہور سے پکڑا آیا۔ پھر انہیں کی رہبری سے پارسن صاحب پٹنہ کو گیا۔ جہاں ایشری پرشاد نام ایک ملازم پولیس اور مسٹر ٹیلر سابق کمشنر پٹنہ جو ۱۸۵۷ء میں مولوی احمد اللہ صاحب وغیرہ موحدوں کو بے قصور نظر بند کرنے کے قصور میں برخاست ہو گیا تھا اُن کے مددگار ہو گئے۔ جن کی غیبت سے اُس نے مولوی یحییٰ علی صاحب اور مولوی عبدالرحیم صاحب و الٰہی بخش و میاں عبدالغفار

کو گرفتار کرکے انبالہ کو بھیجدیا۔ اور پھر پارسن صاحب بنگال کو گیا۔ جہاں جگہ جگہ بہت لوگوں کو گرفتار کیا۔ اکثر لوگ تو لاکھوں ہزاروں روپیہ خرچ کرکے رہا ہو گئے۔ اور بہتوں کو پھانسی دینے کی دھمکی دے کر گواہ بنالیا۔ صرف ایک قاضی میاں جان ساکن کمارکھلی ثابت قدم رہے جو گرفتار ہو کر انبالہ کو آئے۔ نصیر الدین و علاؤ الدین سوداگران دہلی اور دوسرے بہت سے لوگ دہلی سے بھی گرفتار ہو کر آئے پشاور سے لے کر شرقی و شمالی کنارہ بنگال تک شاید کوئی مالدار مسلمان یا مولوی و نمازی باقی رہا ہو جس کو ایک دفعہ پولیس نے پکڑ کر بقدر وسعت اُس کے اپنا ہاتھ گرم نہ کر لیا ہو۔ غرض اِس جھوکے میں دسمبر سے اپریل تک بڑی پکڑ دھکڑ رہی صدہا آدمیوں کو ڈرایا اور سکھلا کر گواہ بنالیا۔ اِس پارسن گروی کے دَورہ میں وہ بیچارہ حسینی تھانیسری بھی جب دہلی سے اشرفیاں لے کر لوٹا چلا آتا تھا۔ پکڑا گیا اور کل اشرفیاں ضبط کرا کے بے قصور ہمارے ساتھ ہی دائم الحبس ہو گیا اِس مقدمہ میں ہم نے دیکھا کہ بڑے بڑے صاحب لوگوں نے قانون و آئین سب طاق پر رکھ دیا تھا۔ اور ایشری پرشاد وغیرہ ہندو مسلمان نے اپنے فائدے کے اِس مقدمہ کو رسی سے سانپ اور رائی سے پہاڑ بنا دیا۔ اور ہم لوگوں کو نپولین یا مہدی سوڈانی سے زیادہ دشمن دولت انگلیشہ کا ٹھیرا کر اپنا مطلب نکالنا چاہا۔ چنانچہ ایشری پرشاد وغیرہ جو نہایت ادنیٰ عہدے پر تھے، ڈپٹی کلکٹر وغیرہ ہو گئے اور بڑی بڑی زمینداری اور جاگیر دھوکہ دے کر سرکار سے لے لی۔ اور غزن خان مخبر نے

تو ایک محض جھوٹا قصہ اپنے بیٹے کے قافلہ کو بھیجنے کا گھڑ کر ایک دو گاؤں جاگیر سرکار سے لے لئے۔ اور اخیر ۱۸۶۰ء سے دس برس تک برابر ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت برپا رکھی۔ صدہا مسلمان مارے خوف کے گھر بار چھوڑ کر عرب وغیرہ ملکوں میں جا بسے۔ خود غرضوں اور خوشامدیوں اور ہمارے مدعی اور دشمنوں نے خوب دل کے چاؤ نکالے۔ دس برس تک اخباروں میں سوائے اس قصہ اور بحث کے کوئی دوسری بات کم ہوتی تھی۔ ایک محکمہ معہ گواہ شاہدوں کے اس دار و گیر کے واسطے برسوں تیار رہا۔ جس کو چاہا پکڑ لیا اور جو چاہا رشوت سے لی۔ اور جس نے نہ دی اس پر معمولی گواہوں سے گواہی دلا کر دائم الحبس کر دیا۔ چیمبرلین صاحب اس دار و گیر وہابیوں کے کمشنر ہو کر راولپنڈی اس کا صدر مقام ہوا۔ چنانچہ مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی جو ایک نامی خیر خواہ دولت انگلشیہ کے ہیں، واسطے خدمت گویندہ گری وہابیوں کے دہلی سے راولپنڈی طلب ہوئے۔ لیکن ابھی کچھ کارروائی شروع نہ ہوئی تھی۔ کہ اس احکم الحاکمین اور سریع الانتقام کو یہ کارروائی ظلم اپنے برگزیدہ بندوں پر پسند نہ ہوئی۔ بہ اجرا واثٹ موت ناگہانی خود چیمبرلین صاحب کی اُس دربار عالی میں طلبی ہو گئی۔ اُن کے مرنے کے بعد پھر کسی دوسرے صاحب کو اس خدمت خطرناک کے قبول کا حوصلہ نہ ہوا تو پھر وہ محکمہ ہی ٹوٹ گیا۔ اور غریب مسلمان بوجہ اس تائید غیبی کے

اِس آفتِ ناگہانی سے محفوظ رہے۔ اور مولوی نذیر حسین صاحب جن پر واسطے اظہار نام کل ممبرانِ اہلحدیث باشندگانِ ہند کے جبر کیا جاتا تھا، رہا ہو کر اپنے گھر کو واپس آ گئے۔ اور اِن خود غرضوں نے اِن سو دو سو فقیرانِ ساکنانِ ملک غیر کا ڈر اور رعب ہماری ایسی بہادر اور دانا سرکار کے دل پر اتنا جمایا اور اس میں ایسا مبالغہ کیا کہ گویا سلطنتِ انگریزی کا قلع قمع کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ اور جس قدر اس کا اثر ہماری فاتح قوم پر ہوا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ اس میں کیسے رسی کا سانپ اور رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے۔ اور کن کن لایعنی دلائل سے فاتح اور مفتوح میں عداوت ثابت کی ہے اور طرہ یہ کہ علی العموم بلاتخصیص تمام ہند کے مسلمانوں پر حملہ کیا ہے حالانکہ اس تحریر کے بعد بڑے بڑے موقعوں پر ہند کی خیر خواہی و خیر سگالی ثابت ہو کر وہ کتاب جو بوجہ فاتح اور مفتوح کے دلوں کو بگاڑنے والی ہے قابلِ اعتبار نہیں رہی ہے۔ اور مولوی سید احمد صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی نے شروع ہی میں بڑے دلائل سے اِس خیالی پلاؤ ڈاکٹر ہنٹر کو رد کر کے اس کی دھجیاں اُڑا دی ہیں۔ اور ہر دعوے کو اصول ہی سے غلط ثابت کر دیا ہے۔ مگر تو بھی اِس کتاب ڈاکٹر ہنٹر کا جادوانہ اثر ابھی تک اکثر انگریزوں کے دلوں پر ہے جو وہابیوں کو اپنا جانی دشمن جانتے ہیں اور اگرچہ ابتدائے

عملداری پنجاب سے افغانوں نے صدہا بڑے بڑے معزز انگریزوں اور میم
اور بچوں کو بلکہ گورنر جنرل تک کو مار ڈالا۔ اور ابھی تک جہاں موقع پاتے ہیں
اپنی اُن حرکات سے باز نہیں آتے۔ اور اُن کے مولویوں نے عام فتویٰ دے
رکھا ہے۔ کہ انگریزوں کا مارنا بڑا ثواب ہے۔ مگر توبھی انگریز افغانوں کو اپنا
اِس قدر دشمن نہیں جانتے جس قدر وہابیوں کو ڈاکٹر ہنٹر کی بدولت اپنا
دشمن فرض کر رکھا ہے۔

مقدّمہ آمدم برسرِ مطلب دسمبر سے اپریل تک یہ سب دار و گیر ہو کر
بماہ اپریل مجسٹریٹی ضلع انبالہ میں یہ مقدمہ پیش ہوا اور ہم
سب لوگوں کو پھانسی گھروں سے نکال کر کچہری میں لے گئے۔ اُس وقت
معلوم ہوا کہ میرا حقیقی بھائی محمد سعید میرے اُوپر اور محمد رفیع حقیقی بھائی محمد شفیع
کا اُس کے اُوپر پھانسی کی دھمکی سے گواہ ہو گئے۔ اور اُسی کارروائی سے
پچاس ساٹھ آدمی جن میں اکثر مولوی مُلّاں تھے، ہمارے اُوپر گواہ بنائے
گئے۔ لیکن اکثر گواہی دیتے وقت بھی ہماری طرف دیکھ کر زار زار روتے جاتے
تھے مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیویں تو قطع نظر مار پیٹ کے پھانسی کا سامنا تھا
اور یہ سب گواہ تا ادائے شہادت محکمہ سشن کے مثل قیدیوں کے زیرِ حراست
پولیس رکھے گئے تھے۔ اور پولیس ہی سے اُن کو عمدہ خوراک اور لباس ملتا تھا
چنانچہ لاکھوں روپیہ سرکار کا اُن بیجا کارروائیوں میں صرف ہو گیا۔ اور مار پیٹ

کی تو یہ حالت تھی کہ عبّاس نام ایک لڑکا جو مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش
پایا تھا، جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے محبت کے جھوٹا
اور آموختہ بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا۔ تو اسی روز رات اس کو ایسی
سزا سخت دی گئی کہ وہ بچہ اسی صدمہ سے قبل از پیشی مقدمہ سیشن کے مر گیا
مگر رفع بدنامی کے واسطے پارسن صاحب نے اس کا مرنا کسی مرض سے مشہور
کر دیا تھا۔ جس دن ہم اوّل روز مجسٹریٹی میں حاضر کئے گئے۔ تو میرا بھائی بھی
بزمرۂ گواہانِ زیر حراست پولیس تھا۔ اس نے مجھ کو بذریعہ ایک سپاہی پولیس
کے یہ خبر بھیجدی کہ مجھ کو پولیس نے مار پیٹ کر تمہارے اوپر گواہ بنا لیا ہے
سو اب جس وقت برسرِ اجلاس میرے اظہار تحریر ہوں گے تو میں اپنے اس
بیان سے جو مار پیٹ کر لکھایا ہے، پھر جاؤں گا۔ اس کے جواب میں میں نے
اس کو کہلا بھیجا کہ میری قید اور رہائی کچھ تمہارے بیان پر موقوف نہیں ہے
وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تمہارا اظہار بحلف ہوا ہے تو آپ اس سے
پھر جانے پر بجرم دروغ حلفی تم کو سزا سخت ہو جاوے گی۔ میں تو پہلے سے پھنسا
ہوا ہوں۔ تمہارے پھنس جانے سے والدہ ضعیفہ صدمہ کھا کر ہلاک ہو
جاویگی۔ اس واسطے بہتر ہے کہ جو تم نے پہلے لکھایا ہے وہی اب بھی بیان
کر دیں لیکن باایں ہمہ جب اس کا اظہار میرے سامنے ہونے لگا تو وہ پہلے
اظہار سے منکر ہو گیا۔ صاحب لوگ برسرِ اجلاس اس کا انکار سن کر اوّل تو

بڑے غصے ہوئے مگر بوجہ اس کی صغرسنی کے اس کو کچھ سزا نہ دے سکے۔ اس کا نام گواہوں سے کاٹ کر اس کو نکال دیا کثرت گواہوں کے سبب سے ایک ہفتہ تک فقط یہی مقدمہ کچہری مجسٹریٹی میں پیش ہوتا رہا۔ صاحب لوگوں کا تعصب ہم لوگوں سے یہاں تک تھا کہ جب بروقت دو پیشی مقدمہ کے ہم نے یہ درخواست کی کہ ہماری نماز کا وقت آگیا ہے۔ ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جاوے تو یہ اجازت بھی ہم کو نہ دی گئی۔ مگر وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے۔ ہم نے عین دوران مقدمہ میں تیمم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لی۔ ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سپرد سشن ہوا۔ اس وقت تک ہم پھانسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ قید تھے۔ بعد سپردگی سشن کے ہم سب کو ایک جگہ حوالات میں بند کر دیا۔ اب بعد ایک مدت کی تنہائی اور چلہ کشی کے جو ہم سب دوست ایک جگہ جمع ہوئے تو بڑی خوشی ہم لوگوں کو ہوئی میں تو سعدی کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا تھا ؎

پائے در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

مگر ایک مدت دراز چار ماہ تک کے تخلیہ اور تنہائی سے بھی ہم لوگوں کو بہت روحانی فائدہ ہوا تھا۔ انوار الٰہی آئینۂ صافیہ قلب میں خوب محسوس ہوتے تھے۔ نماز روزے میں کمال لذت حاصل ہوتی تھی۔ کہ شاید وہ کیفیت

برسوں کی چلہ کشی اور گوشہ نشینی میں بھی حاصل نہ ہوتی۔ اُس وقت مولوی یحییٰ علی صاحب کی صحبت ایک مغتنمات سے تھی۔ مگر محمد شفیع اور عبد الکریم یہ دونوں آدمی کسی قدر کشیدہ خاطر رہا کرتے تھے باقی ہم نو آدمی اِس حوالات میں بھی نہایت شاداں اور فرحاں تھے۔ اور یہ خاکسار تو جب اپنی ذلیل النسبی اور کم علمی پر خیال کرکے اِنعامات الٰہی اور اس سرفرازی کو جو میرے حال بدمآل پر مبذول تھی، مقابلہ کرکے دیکھتا۔ تو سمجھتا تھا کہ میری مثل ٹھیک ایسی ہے کہ جیسے کسی چمار کے سر پر بلا واسطہ وسفارش و بلا استحقاق ولیاقت ذاتی کے تاج شاہی رکھ دیا جاوے۔ میں اور میرا حسب نسب اور لیاقت کہاں اور یہ سرفرازی خدا کے راہ میں امتحان ہو کر ثابت قدم رہنے کی کہاں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ کہ ایسے امتحانوں میں پیغمبر اور صحابہ لوگ بھی گھبرا جاتے تھے۔ اس صبر اور استقلال کے انعام کو خیال کرکے اول سے آخر تک میری زبان پر تو شکر ہی شکر جاری رہا۔ مولوی یحییٰ علی صاحب کی کیفیت اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ وہ اکثر اس رباعی کے مضمون کو ادا کیا کرتے تھے ؎

لست ابالی حین اقتل مسلما ۔۔۔ علی ای شق کان للہ مصرعی

وذلک فی ذات الالہ وان یشأ ۔۔۔ یبارک علی اوصال شلو ممزع

ترجمہ:۔ نہیں پرواہ کرتا ہوں میں جبکہ مارا جاؤں میں مسلمان کسی کروٹ پر ہو پھر کر جانا میرا طرف خدا کی۔ اور یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اگر چاہے برکت دیوے

اُوپر ہلا دینے ٹکڑوں پراگندہ کے" اور یہ وہ رباعی ہے۔ جب حضرت حبیبؓ ایک صحابی کو کفار مکہ پھانسی دینے لگے۔ تو اُس نے نہایت جوانمردی سے یہ رُباعی پڑھ کر راہِ خدا میں جان دی اور شہید ہوا۔ اور اُس کی موت کی خبر اور اُس کا سلام خود جبرئیل علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مدینہ میں پہنچایا تھا۔ مولوی یحییٰ علی صاحب بڑے درد او رعشق سے یہ شعر بھی اکثر سید صاحب کے فراق میں پڑھا کرتے تھے ؎

اپنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گذرے
کونسی رات آپ آئیں گے دن بہت انتظار میں گذرے

کچھ عرصہ کے بعد آخر اپریل میں یہ مقدمہ باجلاس میجر ایڈورڈس صاحب محکمہ سشن میں پیش ہوا۔ وہاں بھی ایک ہفتہ تک روبکاری ہوتی رہی محمد شفیع اور عبدالکریم کی طرف سے مسٹر گڈال ایک بیرسٹر محکمہ مجسٹریٹی میں وکیل اور پیروکار تھے اور جب یہ مقدمہ کچہری سشن میں پیش ہوا۔ تو مولوی محمد حسن صاحب اور مولوی مبارک علی صاحب نے جو پٹنہ والوں کی طرف سے پیروکار تھے۔ مسٹر پلوڈن نام ایک دوسرے وکیل کو بلایا۔ یہ وکیل بڑا جہاں دیدہ اور فہمیدہ ایک مسن آدمی تھا جب پلوڈن صاحب اپنا مختار نامہ لے کر حوالات میں ہمارے دستخط کرانے کو آیا۔ تو مولوی عبدالرحیم صاحب مولوی یحییٰ علی صاحب و الٰہی بخش سوداگر و حسینی و قاضی میاں جان صاحب و عبدالغفار و منشی عبدالغفور آٹھ مدعا علیہم نے اُس پر

دستخط کر دیئے۔ مگر میں نے اپنے دستخط نہیں کیئے۔ اور کہا کہ میں خود وکیل ہوں۔
اپنی جوابدہی آپ کروں گا۔ مولوی یحییٰ علی صاحب اس تقرری وکیل اور بربادی
روپیہ سے راضی نہ تھے۔ بلکہ اگر دوسرے لوگ ان کو نہ روکتے تو وہ اپنے نیک
اعمال کا اقبال کرنے کو تیار تھے۔ مگر اُن کی طبیعت کچھ ایسی سیدھی اور بے عذر
تھی۔ کہ جب اُن سے مختار نامہ پر دستخط کرنے کو کہا گیا تو بے عذر اس پر بھی دستخط
کر دیئے۔ اب سرکار کی طرف سے میجر ٹکفیل صاحب اور پارسن صاحب پیرو کار
اور وکیل تھے۔ اور دش مدعا علیہم کی طرف سے دو وکیل اور میں ایک بذات خود
اپنی جوابدہی کرتا تھا جب کوئی گواہ پیش ہوتا تو پہلے اس کا بیان صاحب سشن جج آپ
لکھتے۔ اور سوال جرح کے خود کرتے۔ بعد اس کے سرکاری وکلاء اور اُس کے بعد ہر دو
وکلاء مدعا علیہم ایک دوسرے کے بعد اور سب کے آخر میں یہ خاکسار سوالات جرح کے
کرتا۔ چونکہ میں سب سے زیادہ اِس مقدمہ سے واقف اور ان گواہوں کے حالات
اور علم لیاقت سے بھی بخوبی آگاہ اور اس فن وکالت میں بھی پورا تجربہ حاصل اور اس
وقت بہ نسبت دوسروں کے مجھ کو خدا تعالیٰ سوالات جرح بھی خوب سوجھاتا تھا۔
اکثر گواہ میرے سوالات کے جواب سے تنگ آ کر دوہائی دوہائی کرنے لگتے تھے
اور بوجہ اجلاس عام ہونے کے بہت سے یورپین اور دیسی تماشہ بین حاضر ہو کر
یہ تماشا دیکھا کرتے تھے۔ چار ایسسر دو ہندو و دو مسلمان رؤسا ضلع انبالہ سے بلائے
گئے تھے۔ جب شہادت طرفین تمام ہو گئی تو مدعا علیہم کے جواب لئے گئے۔ دس

مجرموں کا جواب تو اُن کے وکیلوں نے تحریری داخل کیا۔ اخیر میں صاحب سشن جج نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ بولو اب تمہارا کیا جواب ہے۔ تب میں نے ہر ایک ثبوت مدخلہ سرکار کی تردید بیان کر کے اپنا جواب نہایت مشرح اور مدلل لکھانا شروع کیا۔ صاحب سشن جج نے اس میں سے کسی قدر لکھ کر بڑے غصہ سے مجھ سے کہا کہ اس جواب سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے قصور کا اقبال کر کے عدالت کی مہربانی اور رحم سے اپنی معافی مانگو۔ میں یہ مخالفانہ تعلیم کا سبق سن کر چپ ہو رہا۔ اور کہا کہ میں فقط انصاف چاہتا ہوں۔ سو آپ سے اس کی اُمید نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد میں نے دس بارہ آدمی گواہ اپنی بریت کے بلانے چاہے سو وہ بھی بلائے نہ گئے۔ بلکہ جب واقعہ ۲ مئی ۱۸۶۴ء روز سنانے کا حکم کے اپنے گواہوں کو میں نے آپ حاضر کرا دیا تو بھی اُن کے اظہار نہ لکھے گئے۔ مگر محمد شفیع اور دوسرے اکثر مدعا علیہم کی طرف سے بہت سے گواہ گذرے لیکن بے سود کون سنتا ہے؟ بلکہ محمد شفیع کی طرف سے ایک سو سے زیادہ سارٹیفکیٹ خیر خواہی و خیر سگالی سرکار و عمدہ کارگذاری کے پیش ہوئے۔ جن کی نسبت اس متعصب جج نے یہ لکھا کہ ہر ہر فقرہ ان سارٹیفکیٹوں کا محمد شفیع کے مجرم اور مستحق سزائے سخت ہونے پر ایک دلیل ساطع اور برہان قاطع ہے۔ ہمارے لائق اور دیرینہ وکیل مسٹر پلوڈن نے بہت سی قانونی کتابوں اور نظائر سے ثابت کر کے یہ جواب لکھا تھا کہ ملکہ ستھانہ وغیرہ مقامات جہاں یہ جنگ جس کی اعانت

کرنے کا اُن لوگوں پر الزام ہے، واقعہ ہوُا عملداری سرکار سے باہر ہیں۔ اور لفظ جنگ کرنا یا ملکہ معظمہ یا بغاوت مصرحہ دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کسی جنگ وقوعہ بیروں حدود عملداری سرکار پر صادق نہیں آتا۔ چنانچہ تمثیل ب زیر دفعہ ۱۲۱ اصاف لکھا ہے کہ زید نے جو ممالک ہند میں ہے باغیوں کو ہتھیار بھیجنے سے ایک بغاوت میں اعانت دی جو گورنمنٹ ملکہ معظمہ واقعہ سیلون کے مقابلہ میں (اندر حدود ممالک مقبوضہ ملکہ کے) ہوئی۔ تو زید ملکہ معظمہ سے جنگ کرنے میں اعانت کا مجرم ہوگا۔ اِس واسطے ان لوگوں کو اِس دفعہ کے رو سے سزاء نہیں ہوسکتی جب صاحب سشن جج اور دوسرے انگریزوں نے یہ دلیل وکیل کی سنی تو ایک دم سرد ہوگئے۔ اور سوائے ہاں اور بجا کے کوئی جواب نہ بن آیا۔ مگر اِس مقدمہ میں تو انگریزوں کو پرلے سرے کا تعصب تھا۔ شروع کارروائی سے مقدمہ میں قانون طاق پر رکھ دیا تھا۔ اِس واسطے بعد لینے اِس جواب کے واسطے مشورہ باہمی کے مقدمہ کو چند روز کے واسطے ملتوی کر دیا گیا۔ اور جان لارنس صاحب بہادر گورنر اور دوسرے بڑے بڑے افسران سے جو خواہ نخواہ ہمارا قلع قمع ہی چاہتے تھے مشورہ کیا گیا۔ ان کو تو خود غرضوں نے یہ سوجھا رکھا تھا۔ کہ اگر ان چند غریبوں کو پھانسی دے کر وہابیوں کا ہند سے قلع قمع نہ کر دو گے تو عملداری سرکار ہند میں رہنا محال ہے۔ پھر قانون کو کون سنتا ہے۔

فیصلہ۔ بعد التوائے دراز کے ۲ مئی ۱۸۶۴ئہ کو پھر ایک آخری اجلاس

سیشن ہوا۔ اور جج صاحب موصوف اپنی تجویز اور فتویٰ سزا اپنے اپنے گھر پر بیٹھکر حسب ایماء گورنر صاحب کے لکھ لائے تھے۔ اُس دن اجلاس میں بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلے چاروں اسیسروں سے سیشن جج صاحب نے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ آپ لوگوں نے اِس مقدمہ کو اول سے آخر تک سُنا۔ اَب جو آپ کی رائے ہو لکھ کر پیش کرو۔ ہم نے دیکھا کہ یہ چاروں اسیسر اُس وقت بھی ہماری شکلوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بھر بھر لاتے تھے۔ اور دل سے ہماری رہائی کے خواہاں تھے۔ مگر جب صاحب جج و کمشنر کی رائے کو ہماری سزا و پر مائل پایا۔ تو مارے ڈر کے اُنھوں نے بھی لکھ دیا کہ ہمارے نزدیک بھی جرم مندرجہ فرد قرارداد اُن پر ثابت ہے۔ پھر تو صاحب جج و کمشنر نے بعد حصول اِس حیلۂ قانونی کے اپنی تجویز جو پہلے سے میز پر لکھی ہوئی رکھی تھی پڑھنی شروع کی۔ جس میں آئیں بائیں شائیں کر کے پلوڈن صاحب کی عمدہ دلیل کا جواب تھا۔ اور پھر سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم بہت عقلمند اور ذی علم اور قانون داں اور اپنے شہر کے نمبر دار اور رئیس ہو، تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا۔ اور باوجود فہمائش کے اُس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اِس واسطے تم کو پھانسی دی جاوے گی

اور تمہاری کل جائداد ضبط سرکار ہوگی۔ اور تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ دی جاوے گی۔ بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستان جیل میں گاڑ دی جاویگی۔ اور اخیر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہونگا۔ یہ سارا بیان صاحب موصوف کا میں نے نہایت سکوت سے سنا مگر اس آخری فقرہ کے جواب میں میں نے کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کرے۔ لیکن اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور میرا کیا کر سکتا تھا۔ جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں سب دے چکا تھا۔ لیکن اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ ایسا نکلا تھا۔ کہ میں تو اس وقت تک زندہ موجود ہوں مگر وہ اس حکم دینے کے تھوڑے عرصہ بعد ناگہانی موت سے راہی ملک عدم ہوا۔ مجھکو اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سن کر ایسا خوش ہوا تھا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا۔ اس حکم کے سننے سے میری وہ کیفیت ہوئی کہ گویا جنت فردوس اور حوریں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگ گئی تھیں۔ میرے بعد مولوی یحییٰ علی صاحب اور ان کے بعد محمد شفیع اور ان کے بعد نمبروار سب آدمیوں کو حکم سزا کا سنا دیا گیا۔ جن میں میں اور مولوی یحییٰ علی

صاحب اور حاجی محمد شفیع تین آدمیوں کے واسطے پھانسی وغیرہ حسب مذکورہ بالا۔ اور باقی آٹھ مجرموں کو دائم الحبس بعبور دریائے شور معہ ضبطی کل جائداد کے سزا ہوئی۔ میں نے مولوی یحییٰ علی صاحب کو بھی نہایت بشاش پایا۔ لیکن محمد شفیع کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ تاہم اُنھوں نے بھی اپنی طبیعت کو بہت تھاما۔ اُس دن پولیس والے اور تماشہ بین مرد عورت بکثرت حاضر تھے۔ قریب تمام کے احاطہ کچہری ضلع انبالہ کا خلقت سے بھرا ہوا تھا۔ حکم سنا کر اس کا چپ ہونا تھا کہ صدہا مسلح اہل پولیس زیر حکم کپتان پارسن صاحب میرے نزدیک آکر کہنے لگا کہ تم کو پھانسی کا حکم ملا ہے تم کو رونا چاہیئے۔ تم کس واسطے اتنا بشاش ہے۔ میں نے چلتے چلتے اس کو بولا کہ شہادت کی اُمید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے اور تم اس کو کیا جانو اس مقام پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ پارسن صاحب بھی ایڈورڈس صاحب سے بڑھ کر متعصب تھا۔ اور اس مقدمہ میں شروع سے اس نے ہم لوگوں پر بہت ظلم کیا تھا کہ جس کی تفصیل یہ قلم بھی نہیں کر سکتی۔ مگر خداوند تعالیٰ منتقم حقیقی تو موجود تھا۔ گو اس کام دیر اور سہولیت سے ہوتے ہیں۔ ہم کو سزا ہو کر تھوڑے دن گزرے تھے۔ کہ یہ بے خوف بھی دنیا ہی میں پاگل ہو کر راہی ملک عدم ہوا اُس دن تماشا بین لوگ ہماری پھانسی کا حکم سن کر اکثر زار زار روتے تھے کوئی خدا کی مرضی اور رضا بقضائے سے اپنے رنج کو روکتا تھا۔ کوئی دم بخود سا

ہو کر ہم کو دیکھ رہا تھا۔ جیلخانہ تک بیسیوں مرد عورت اِدگرد سڑک کے ہمارا منہ دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ اسی حالت کے اندر پولیس ہم کو جیلخانہ میں لے گئی اور وہاں پہنچ کر ہمارے کپڑے اور لباس معمولی اتار کر ضبط کر لیئے گئے اور ہم سب کو گیروا لباس پہنا دیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا۔ باقی آٹھ آدمیوں کو جیلخانہ میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ ملا دیا۔ ۲۰ مئی کی رات کو جب ہم ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں جو نواب سراج الدولہ کے بلیک ہول قلعہ کلکتہ سے بھی بڑھی ہوئی تھیں بند ہوئے تو پہلی ہی رات کو ایک جہنم کا نمونہ ہو گیا۔ اس کی صبح کو ہم نے اہلیان جیلخانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کر کے چاہا۔ کہ کسی طرح ہم کو بوقتِ شب ان کوٹھڑیوں سے باہر رکھا جائے۔ مگر سب اہالی جیلخانہ مارے ڈر کے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ لیکن اُن کا اِنکار کر کے جیلخانہ سے باہر نکلنا تھا۔ کہ سامنے سے ایک سوار تار گھر سے ایک لفافہ ضروری لے کر پہنچا۔ لفافہ کھول کر جو دیکھا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان تینوں پھانسی والوں کو بوقتِ شب میدان میں باہر سلایا کرو۔ یہ طرفہ تماشا تائیدِ الٰہی کا دیکھ کر اسی دم جیلخانہ والوں نے ہم کو یہ حکم سنا دیا۔ ہمارے واسطے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور اُن کے ریشمی رسے تیار ہوئے۔ اور ادھر مثل مقدمہ کو واسطے منظوری پھانسی کے محکمہ چیف کورٹ پنجاب میں بھیج دیا۔

چیف کورٹ

ہمارے دونوں وکیل بھی کچھ زائد محنتانہ لے کر معہ مولوی محمد حسین صاحب اور مولوی مبارک علی صاحب و محمد سعید میرا بھائی و عبدالرحمٰن پسر محمد شفیع کے چیف کورٹ میں پہنچے۔ اور ہیجر و نکفیلڈ صاحب وغیرہ سرکاری وکلا اور پیروکار بھی سب سے پہلے جا حاضر ہوئے۔ ادھر جیل میں نقل حکم منگوا کر میں نے بھی ایک اپیل خوب مدلل لکھ کر معرفت سپرنٹنڈنٹ جیل کے چیف کورٹ کو روانہ کر دیا۔ محکمہ چیف کورٹ میں بھی چند اجلاسوں میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ یہ مقدمہ پیش ہوا۔ اور وہاں بھی مسٹر بلوڈن ہمارے وکیل نے بڑے دلائل سے باصرار تمام کہا کہ زیر دفعہ ۱۲۱ الف یہ لوگ ہرگز قید نہیں ہو سکتے۔ اِس دفعہ کے رو سے ان کو قید کرنا سراسر خلاف قانون ہے۔ کوئی دوسری دفعہ اُن پر قائم کرو۔ مسٹر رابرٹ کسٹ صاحب نے جو اس زمانہ میں جوڈیشنل کمشنر تھے۔ اِس قانونی دلیل وکیل کو بر سر اجلاس تسلیم کر لیا۔ لیکن وہاں بھی مشورہ کرنے کے واسطے چند روز کا التوا کیا گیا۔ اُس کے بیچ میں اخبار والوں نے اپنی اپنی رائے لگا دی کہ یہ لوگ رہا ہو چکے فقط حکم سنانا باقی رہ گیا ہے۔ ہمارے گھر والوں کو تو ہماری رہائی پر اس قدر یقین ہو گیا تھا کہ ہمارے گھر سے ایک نیا جوڑا

کپڑوں کا بھی تیار ہو کر آگیا تھا۔ کہ بروز رہائی میں اس کو پہن کر گھر آؤں گا۔
چیف کورٹ کا التوا بہت لمبا ہوا۔ غالباً ولایت تک کی رائے ہم کو خلاف
قانون قید کرنے پر لی گئی۔ ۲ مئی تاریخ سنانے حکم پھانسی سے ۱۶ ستمبر تک
ہم پھانسی گھروں میں بند رہے۔ اہالیان جیل ہمارے پھانسی دینے کا
سامان تیار کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشا بن رہے تھے صدہا
صاحب لوگ اور میم روزانہ ہمارے دیکھنے کو پھانسی گھروں میں آتے تھے
مگر برخلاف دوسرے عام پھانسی والوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں
پا کر یہ یورپین زوارین بہت تعجب کرتے اکثر ہم کو پوچھتے تھے کہ تم کو بہت
جلد پھانسی ہوگی تم خوشی کس واسطے کرتے ہو ہم اس کے جواب میں صرف
اسی قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدائی راہ میں ایسے ظلم سے
مارے جانے پر درجہ شہادت کا ملتا ہے۔ اس واسطے ہم کو خوشی ہے۔
شان الہی سے ہم پھانسی گھروں میں ہی تھے۔ کہ بقرعید آگئی ہم کو خیال
ہوا کہ آج مسلمان خوب قربانی کا گوشت اڑاتے ہوں گے۔ اس خیال
کے تھوڑی دیر بعد بوقت شب پلاؤ اور قورمہ اور قیمہ اور کباب وغیرہ
بقرعید کے سب کھانے ہمارے واسطے اس پھانسی گھر میں غیب سے
موجود ہو گئے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور شکر الہی ادا کیا۔ ایک دن
رات کو اس پھانسی گھر میں ہم تینوں آدمی ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں

کرتے تھے کہ اُس وقت ہمارے سب محافظ آپس میں صلاح کرکے ہم سے کہنے لگے۔ کہ تم تینوں آدمی اس وقت اندھیری رات میں بھاگ جاؤ۔ ہم کو بجرم غفلت کچھ قید وغیرہ کی سزا ہو جائے گی۔ سو ہم اس کو بھگت لیویں گے۔ لیکن تمہاری تو جان بچ جاوے گی۔ ہم لوگوں نے یہ بات سُن کر اُن کی ہمت اور نیت خیر کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ خداوند کریم دونوں جہان میں اِس نیک نیتی کا اجر تم کو دیوے مگر ہم نہیں بھاگیں گے۔ جب خدا چھوڑ دے گا۔ آپ سے آپ چھوٹ جاویں گے۔ اور میں نے یہ بھی کہا کہ جب اُس کی مرضی نہ تھی۔ تو بھائیو! میں علی گڈھ سے پکڑا ہوا آگیا۔ اب ہم سے ایسی حرکت دوبارہ نہ ہوگی۔ بقول شاعر ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست

مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

جب ہم پھانسی گھروں میں قید تھے۔ تو قاضی میاں جان صاحب بیمار ہو کر ہسپتال میں گئے۔ مگر ہسپتال سے بھی اکثر ہماری ملاقات کے واسطے پھانسی گھروں میں آیا کرتے تھے۔ اپنے مرنے کے وقت سے ایک دو دن پہلے انھوں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ ایک تخت جواہر نگار آسمان سے اترا اور اُن کو اُس پر بٹھلا کر آسمان پر لے گئے۔ اُس کے دوسرے دن اُن کی وفات ہو گئی۔ اور تعبیر خواب وہی ہوئی کہ وہ تخت فردوس سے اُن کے لینے کے واسطے آیا تھا اور لے گیا۔ یہ بزرگ ہم لوگوں میں سب سے زیادہ سن تھے۔ مگر با این ہمہ بڈھاپے

اور مستقل مزاج تھے۔ خداوند کریم اُن کو جنّت نصیب کرے۔ ہمارے ہمراہیوں نے اُن کو غسل اور کفن دے کر اور اُن کی نماز جنازہ پڑھ کر گورستانِ جیل میں اُن کو دفن کرا دیا۔ جب ہم پھانسی گھروں میں بند تھے انہیں ایام میں ایک رات کو بمقام تھانیسر میری والدہ کو ایک سانپ نے کاٹا۔ اُس کے زہر سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ سنا ہے کہ وہ بھی بہت استقلال سے جان بحق تسلیم ہوئیں۔ بہت لوگوں نے کچھ مشرک جھاڑ پھونکنے والوں کو بلا کر اُن کی صحت کے واسطے کچھ رسومات شرک کرنا چاہا تھا مگر انھوں نے فرمایا کہ میرے گھر سے شرک بدعت مدّت سے اُٹھ گیا ہے۔ اب میں اپنے بیٹے کی غیر حاضری میں اپنے گھر میں شرک نہ ہونے دوں گی۔ ایسی بے ایمانی کی حیات سے موت افضل ہے۔ جب اُن کے مرنے کی خبر ہم کو پھانسی گھر میں پہنچی۔ تو مولوی یحییٰ علی صاحب نے مراقبہ میں اُسی رات کو دیکھا کہ وہ بڑی شان شوکت سے جنّت میں ایک تخت پر بیٹھی ہیں۔ مولوی صاحب نے اُن سے پوچھا کہ یہ مرتبہ عالی آپ کو کس سبب سے ملا؟ انھوں نے فرمایا کہ میرے بیٹے کی مصائب پر صبر کرنے کے سبب سے مجھ کو میرے رب نے بخش دیا اور یہ درجہ عنایت کیا۔ اُس وقت اُن کی وفات بھی ایک امتحان پر امتحان تھا۔ کہ جان و مال، آبرو ہر شئے کی پوری پوری جانچ کی جاوے۔

کالا پانی

مستحق دار کو حکم نظر بندی مِلا!
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

ایک یہ بات بھی اِس مقام پر قابل تذکرہ ہے کہ جس زمانہ میں ہم لوگ پھانسی گھروں میں قید تھے۔ انھیں ایام میں ایک مقبول بارگاہِ الٰہی پر اللہ رب العزت نے یہ منکشف کرا دیا تھا۔ کہ ہم لوگوں کو پھانسی نہ ہوگی مگر کالے پانی کو جانا ہوگا اور میں وہاں سے پھر زندہ باعزت واپس آؤں گا۔ ہماری پھانسی کی موقوفی کا حکم اِس پیشینگوئی کے دو ماہ بعد ہوا۔ مگر ہم لوگوں میں اِس پیشینگوئی سے پورا پورا یقین موقوفی پھانسی اور کالے پانی کو جانے کا ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی اور بعض دوستوں کو اسی وقت اِس خوشخبری کی اِطلاع بھی لکھ دی تھی۔ مگر اُس وقت کہ جب ساری سلطنت انگریزی باتفاق ہمارے پھانسی دینے پر مستعد تھی۔ اور ظاہراً کوئی صورت موقوفی پھانسی کی نظر نہ آتی تھی۔ شاید کسی کو اِس پیشینگوئی کا یقین نہ ہوا ہو۔ کیونکہ وہ ایک ایسا وقت تھا۔ کہ اگر کوئی شخص ہمارے واسطے ذرا بھی کلمۂ خیر کہتا تو قید ہو جاتا تھا۔ بیسیوں آدمی ہمارے شہر کے فقط اِسی قسم کے قصوروں میں قید ہو گئے تھے کہ اُن کے پاس سے

کوئی ایک میرا اسباب نکل آیا۔ یا بعد ضبطی و نیلام میرے مکانات کے میرے بال بچوں کو کسی نے اپنے گھر میں رہنے کو جگہ دے دی اس وقت اگر شاہِ لام بھی میری سفارش انگریزوں سے کرتا۔ تو کبھی منظور نہ کرتے ایسے حالات میں موقوفی پھانسی محض غیر ممکن اور بعید از قیاس تھی۔ اب اِس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی کو سنیئے۔ جب بہت سے صاحب اور ریم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں اور فرحاں دیکھے گئے تو یہ چرچا سب صاحب لوگوں میں پھیلا۔ تب اُن صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت شہادت جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینی نہیں چاہیئے۔ بلکہ اُن کو کالے پانی بھیجکر وہاں کی مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرانا چاہیئے۔ ہم نے دیکھا کہ مطابق اسی ہماری پیشینگوئی کے صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۶ ستمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھکر سنا دیا۔ کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدلی گئی۔ بمجرد سنانے اِس حکم کے ہم کو پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں بلا دیا۔ دو جیلخانہ کے دستور کے موافق مقراض سے ہماری ڈاڑھی مونچھ اور سر کے بال وغیرہ سب تراش کر منڈی پھر سلا

بنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولوی یحییٰ علی صاحب اپنی ڈاڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اُٹھا اُٹھا کر کہتے تھے۔ کہ افسوس نہ کر تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کے واسطے کتری گئی۔

مشقت

ایک تماشہ قدرتِ الٰہی کا اور بھی قابلِ ذکر کرنے کے ہے اور وہ یہ ہے کہ بوجہ میرے بھاری مجرم ہونے کے میرے واسطے ایک ریشمی رسہ اور پھانسی کی لکڑی خاص طور پر نہایت مضبوط تیار ہوئی تھی۔ مگر زبردستی تقدیر سے میری پھانسی تو موقوف ہو گئی۔ اسی اثنا میں بجرم قتل ایک خاص ولایت کے انگلشمین گورہ کو پھانسی کا حکم ملا۔ اور وہ سب سامان پھانسی جو میرے واسطے تیار ہوا تھا اُس بیچارے یورپین ہم قوم کے نصیب ہوا۔ چاہ کندہ را چاہ درپیش۔ جو رسہ بڑے اہتمام سے میرے گلے میں ڈالنے کے واسطے تیار ہوا تھا۔ اُس قادرِ مطلق متقلب القلوب نے ایک ذات بھائی کے گلے میں ڈلوایا اور مجھ کو صاف بچا لیا۔ اِس وقوعہ عجیبہ کے بعد لوگ اِس اسرارِ الٰہی کو ایک بڑی آیاتِ الٰہی سے سمجھتے تھے۔ اسی سبب سے بعد پھانسی اس گورہ کے وہ رسہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تبرکاً لوگوں میں تقسیم ہو گیا۔ بعد سُنانے حکم پھانسی کے جب دوسری فجر کو ہم تینوں آدمی بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ مشقت میں بھیجے گئے۔ تو بنی بخش داروغہ جیل اور رحیم بخش نائب داروغہ اور دوسرے سب دیسی افسر گو جا رہے

عنایت فرماتے تھے مگر بوجہ خوف صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل کے ہم تینوں آدمیوں کو کاغذ کوٹنے کی ڈھینکلی کے کام میں جو اِس جیل میں سب سے زیادہ سخت کام ہے دے دیا۔ تھوڑی دیر تک جب ہم نے اس کو ہلایا۔ تو پاؤں شل ہو گئے مگر اُسی وقت ڈاکٹر ٹبسن صاحب عرف ریلو سپرنٹنڈنٹ جیل سے کاغذ گھر میں تشریف لائے۔ تو ہم کو ڈھینکلی کے سخت کام میں دیکھ کر داروغہ پر بہت خفا ہوئے اور ہم کو اُس سخت کام سے نکال کر محمد شفیع اور مولوی یحییٰ علی صاحب۔ کو تو سُوت کھولنے کے آسان کام میں لگا دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو ایک ناؤگی کے پاس جس میں کاغذ پھاڑ کر بھگوتے تھے، لے گئے۔ اور مجھ سے فرمایا کہ یہ دفتر کی ردّی ہے۔ غالباً تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذ بھی اس میں ضرور ہوں گے۔ تم اپنا دل بہلانے کو ان کاغذات کو پڑھتے بھی رہو اور ردّی کو پھاڑ کر اِس ناؤ میں ڈالتے جاؤ۔ فضل الٰہی سے یہ مشقت بھی دل لگی اور تفریح طبع سے خالی نہ تھی۔ اور ہمارے اور دوسرے ساتھی بھی بتائید الٰہی سے کسی سخت کام میں نہ تھے۔ ہم دن بھر کام کر کے رات کو سب کے سب ایک جگہ بارک میں جا کر سو رہتے تھے۔ جب ہم جیل میں گئے تو قیدیوں کو صرف روٹی اور دال اور ہفتے میں دو یا تین دن ترکاری تیل سے بگھاری ہوئی ملا کرتی تھی گھی اور گوشت یا دودھ دہی کبھی کسی قیدی نے ابتدائے عملداری سرکار سے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ اب تائید الٰہی کا کارنامہ سنیئے ہمارا جیل میں داخل ہونا تھا کہ

بحکم انسپکٹر جنرل مجلس پنجاب کل قیدیانِ پنجاب کو عمدہ گوشت اور گھی اور دہی ملنے لگی۔ ان نعماءِ غیر مترقبہ کو دیکھ کر سب قیدی ہم کو دعا دیا کرتے تھے کہ تمہارے سبب سے ہم نے بھی یہ نعمتیں کھائیں۔ مگر طرفہ یہ کہ جب تک ہم لوگ جیل ہائے پنجاب میں رہے۔ تب تک یہ چیزیں سب جیلخانوں میں برابر ملتی رہیں۔ مگر ہمارا کالے پانی کو روانہ ہونا تھا کہ پھر وہ چیزیں یک قلم بند ہو گئیں۔ بلکہ بجائے گیہوں کی روٹی کے ہمارے جانے کے بعد جوار باجرے کی روٹیاں بیچارے قیدیوں کو ملنے لگیں۔ ہم جیل انبالہ ہی تھے کہ وبائی بخار معہ سرسام بڑے زور شور سے قیدیوں میں پھیلا۔ کوئی چہارم قیدی اسی مرض سے فوت ہو گئے۔ اور یہ کیفیت تھی کہ ادھر بخار آیا۔ ادھر سرسام ہوا اور چٹ سے مر گیا۔ مہینے دو دو مہینے کی میعاد والے قیدی بھی بہت مر گئے۔ جیل کے باہر خیمے کھڑے کر کے قیدیوں کو وہاں لے گئے۔ مگر حضرت بخار وہاں بھی ساتھ ہی گئے۔ یہ خاکسار بھی اُس وبا و عام سے نہ بچا۔ اور سخت بیمار ہو کر شفاخانہ جیل میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر بلٹن صاحب بہت توجہ دلی سے میرا علاج کرتے تھے۔ لیکن بخار کو ذرا بھی افاقہ نہ ہوا۔ گو سرسام کی نوبت نہ پہنچی تھی۔ مگر بے آب و دانہ چند روز تک بیہوش پڑا رہا۔ انگریزی دوائیں ذرہ بھی مجھ پر اثر نہ کرتی تھیں۔ لاچار ہو کر ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تم اپنے گھر میں اِس مرض کے واسطے کیا دوا کھاتے تھے؟ میں نے کہا ہندوستانی دوائیں کھاتا تھا اور ایسے مرض میں میں نے انگریزی دوا

کبھی نہیں کھائی۔ غالبا اِس سبب سے اُن کا کچھ اثر مجھ پر نہیں ہوتا۔ تب انھوں نے فرمایا کہ اُن دواؤں کا نام بھی تم کو معلوم ہے۔ میں نے کہا مجھ کو معلوم ہے۔ تب اُنھوں نے کہا۔ اچھا وہ دوائیں ایک کاغذ پر ہم کو لکھدو۔ ہم بازار سے تمھارے واسطے منگوا دیویں گے۔ تب میں نے مربّہ سیب و مربّہ بہی و شربت انار و شربت بنفشہ و نیلوفر و رق نقرہ وغیرہ عمدہ عمدہ مزیدار و مفرح دوائیاں ایک کاغذ پر لکھدیں۔ اُنھوں نے اُسی وقت وہ سب بازار سے منگو کر میرے حوالہ کر دیں۔ مارے بیماری کے زبان کا مزہ تو بگڑا ہوا تھا۔ میں نے اُن کو بیکے بعد دیگرے کھانا شروع کیا۔ بخار تو قسم محرقہ سے تھا۔ ان شربتوں کے اِستعمال سے دوسرے دن دَفع ہو گیا۔ اور مربوں اور اوراق نقرہ سے بدن اور معدہ میں بھی طاقت اور قوت آگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب دوسرے دن مجھ کو تندرست پایا۔ تو بہت خوش ہوئے۔ اور قوت کے ساتھ شوربا گوشت اور روٹی وہ میرے واسطے مقرر کر دیا۔ مجھ کو اس مقام پر دولت دنیا اور حشم و جاہ کی ناپائداری اور حالت سیمابی اور ہرجائی کا تھوڑا سا ذکر کرنے کا بھی موقع ملا ہے اور اس کی کیفیت مختصر اِس طرح پر ہے کہ ۱۲ تاریخ دسمبر کو اپنی خانہ تلاشی سے تھوڑی دیر پہلے تک میں ہزاروں روپیہ کی جائداد منقولہ اور غیر منقولہ پر قابض تھا۔ بیسیوں آدمی میری رعیّت رہتے تھے۔ ایسے بڑے شہر کا نمبر دار گھوڑے اور گاڑیوں میں سوار ہوا پھرتا تھا۔ ہر کام کے میرے گھر میں نوکر چاکر تھے پایا

اُس کے چند گھنٹے پیچھے جب بعد تلاشی میں فرار ہوگیا۔ تو وہ سب جاہ وحشم خاک میں مل گیا۔ بوجہ میرے فرار یا زیاد غصّہ کے انگریزوں نے قبل از صدور حکم اخیر مقدمہ کے میری کل جائداد پہلے ہی دن قرق کرلی تھی۔ دوسرے دن خود میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدہ میں بھی کھڑا نہ ہونے دیتا تھا۔ ایک ہی رات میں وہ سب مال دوسروں کا ہوگیا۔ میرے وارثوں کو اِس قدر موقع بھی نہ ملا کہ کوئی جائداد قبل از قرقی علیحدہ کرلیویں۔ اور بعد صدور حکم ضبطی کے جب میرے بھائی نے جو نصف کا وارث تھا اپنے حصہ کا دعوی کیا تو اُس کو بھی فقط ایک کوٹھڑی دے کر کل جائداد منقولہ غیر منقولہ ضبط کر کے نیلام کردی۔ میں نے بنظر دور اندیشی اپنے حصّہ کی کل جائداد اپنی بیوی کے مہر میں مکفول کر کے اباٹے بیعنامہ بھی پیش ہوا۔ مگر مارے غصّے اور تعصب کے کسی نے بھی نہ سُنا اور میری بیوی کو معہ دو نابالغ شیرخوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔ بعد تبدیلی حکم پھانسی ہم ستمبر ۱۸۶۴ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک جیل انبالہ میں رہے۔ اکثر اوقات محمد شفیع کے گھر سے بہت سا کھانا عمدہ عمدہ قسم کا ہمارے واسطے آیا کرتا تھا۔ اور ہم لوگ اس کو جیل میں نعمت غیر مترقبہ سمجھکر بڑے مزے سے کھایا کرتے اور شکر الہی بجالاتے۔ یہانتک اپنی تعریف آپ لکھ کر میرا نفس بہت پھول گیا ہے۔ اور اکثر مقامات پر اپنی تعریف میں بہت مبالغہ کرنا چاہتا ہے لہذا اُس کے دو عیب بھی یہاں تحریر کردوں۔ تاکہ اس موذی خود پسند کو

ذرا ذلت ہو۔ اور پھر مجھکو مبالغہ کرنے کی ترغیب نہ دے اور وہ یہ ہے کہ ایک دن رات کو جب ہم ایک مقفل بارک میں سوتے تھے۔ ایک سپاہی محمد شفیع کے گھر سے پلاؤ لے کر آیا۔ ایک جنگلے کے راہ سے وہ پلاؤ لینے کو میں گیا۔ پلاؤ لیتے وقت میرے اس نفس سے نہ رہا گیا۔ ایک بڑی سی بوٹی پلاؤ کی اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ اور تھوڑا سا چبا کر جھٹ پٹ اس کو نگل لینا چاہا۔ وہ مال مسروقہ حلق میں کیسے اترے حلق میں جا کر اڑ گئی۔ نہ نیچے جاتی تھی نہ اوپر آتی تھی۔ میرا دم بند ہو گیا۔ میں لڑکھڑا کر گر پڑا وہ نفس کا عیب ہمارے سب ساتھیوں پر ظاہر ہو گیا۔ جب میرا گلا ملا گیا تو وہ بوٹی بجنسہ باہر نکل آئی۔ میں نے اپنی جانبری اور مال مشتبہ کے حلق سے نیچے نہ جانے پر شکر الہٰی کیا۔ گو محمد شفیع سے ہمارا معاملہ واحد تھا۔ اور اس کی معناً اجازت بھی ہر طرح سے ہم کو حاصل تھی۔ مگر تو بھی یہ حرکت سفلانہ اور نہایت نازیبا تھی۔ مگر حمد ہے اللہ کا کہ اس نے نفس موذی کو بھی ذلت دلائی کہ اب اس کو یاد ہے۔ اور مجھکو اس مال مشتبہ یا مال مسروقہ کے کھانے سے محفوظ رکھا۔

ایک اس سے بڑھ کر اپنے نفس کی شرارت کا حال اور سناتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک دس روپیہ کا نوٹ جیل انبالہ میں بذریعہ ڈاک منشی عبدالغفور خاں ہمارے ایک ساتھی کے گھر سے بذریعہ میرے بھائی کے میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت میرے بھائی کو جیل کے باہر کچھ روپیہ کی ضرورت تھی۔ میں نے منشی عبدالغفور سے اس کے آنے کی اطلاع نہیں کی۔ اور باہر سے اپنے بھائی کو

وہ نوٹ دلا دیا۔ اور اُس نے اپنے کام میں اُس کو خرچ کر لیا۔ جب منشی عبدالغفور خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے میری کچھ شکایت تو نہ کی۔ کیونکہ وہ میرے گھر میں برسوں تک رہے تھے۔ اور مجھ کو اپنا بزرگ جانتے تھے۔ اور اسی بھروسے پر میرے نفس نے یہ جرأت بھی کی تھی۔ تاہم دوسرے لوگوں نے مجھ پر بہت طعن لعن کی تھی کہ دس روپیہ ان کو پھر دے دوں۔ لیکن بعد پہنچنے پورٹ بلیر کے جب میرے ہاتھ میں روپیہ آیا۔ تو میں نے وہ دس روپیہ بذریعہ نوٹ ان کو جیل لاہور میں بھیجدیئے۔ اور اب بعد اظہار ان ہردو عیب اپنے نفس کے میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ مجھ کو معاف فرما دے۔ اور میدانِ محشر میں نیکوں کے سامنے مجھے ذلیل نہ کرے۔

مولوی احمد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جس زمانہ میں ہمارا اپیل چیف کورٹ پنجاب میں دائر تھا۔ اس وقت ہمارے وکیل پلوڈن صاحب نے ہم کو یہ خبر دی تھی کہ انگریزوں کا یہ ارادہ ہے کہ اگر عندالاپیل ہم لوگ چیف کورٹ پنجاب سے رہا ہو جاویں تو خیر ہے۔ ورنہ بعد نامنظوری ہمارے اپیل کے یہ لوگ مولوی احمد اللہ صاحب کو بھی قید کرینگے۔

چنانچہ بعد نامنظوری اپیل کے مولوی احمد اللہ صاحب کے اوپر منجملہ ہم گیارہ بعض سزا یافتہ کے جھوٹے گواہ سکھلا پڑھا کر بنانے شروع ہوئے۔ میر مجیب الدین صاحب تحصیلدار ساکن نارنول جو کسی قصور رشوت ستانی میں جیل انبالہ میں قید تھا۔ اور بظاہر ہم لوگوں سے بڑے اخلاق سے پیش آتا تھا۔ اُس کو انگریزوں نے وعدہ دیا۔ کہ اگر تم بہکا سکھلا کر ان میں سے کسی آدمی کو مولوی احمد اللہ صاحب کے اوپر گواہ بنا دو۔ تو تم کو رہا کر کے پھر تحصیلدار کر دیں گے چنانچہ اپنی دنیوی بھلائی کی اُمید پر اس شخص نے اپنی کارروائی شروع کی۔ مگر جب ہمارے کان میں اُس کے بہکانے اور گواہ بنانے کی خبر پہنچ جاتی تھی تو ہم اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر کہ بھائیو ہماری دنیا تو خراب ہوگئی ہے اب فقط دین باقی رہ گیا ہے۔ جھوٹے گواہ بن کر اُس کو نہ بگاڑو۔ کہیں تمہاری وہ مثل نہ ہو جاوے۔ دونوں طرف سے گئے پانڈے ادھر حلوا نہ ادھر مانڈے جس قدر وہ دن بھر وہ گواہ بنانے کی ترغیب دیتا تھا۔ اُس کا اثر ہماری تھوڑی دیر کی نصیحت سے پھر رفع ہو جاتا تھا۔ اِس مخبر نے صاحب لوگوں سے کہا کہ جب تک محمد جعفر اور مولوی یحییٰ علی صاحب اِس جیل میں ہیں تب تک کوئی گواہ نہیں بن سکتا۔ اِس واسطے ۲۴ ہر فروری ۱۸۶۵ئہ کو مجھ کو اور مولوی یحییٰ علی صاحب اور میاں عبد الغفار کو سنٹرل جیل لاہور کو روانہ کر دیا۔ اور محمد شفیع و عبد الکریم و الٰہی بخش و منشی عبد الغفور وغیرہ کو جیل انبالہ میں رکھ لیا۔ پس

ہمارا اِس جیل سے روانہ ہونا تھا کہ محمد شفیع و عبدالکریم وغیرہ سرکاری گواہ ہو گئے
اور ان کی شہادت پر اولیاء وقت شمس الاسلام مولوی احمد اللہ صاحب بماہِ
مئی ۱۸۶۵ئہ دائم الحبس بعبور دریائے شور مع ضبطی جائداد کے سزایاب ہو کر
ہم سب سے پہلے جون کے مہینے میں داخل انڈمان ہو گئے۔ ملاحظہ مثل مقدمہ
اور دلائل ثبوت جرم نسبت محمد شفیع واضح ہوگا۔ کہ اول محمد شفیع کو کس غیض اور
غصہ سے پھانسی کا حکم دے کر اُس کی پچاس لاکھ کی جائداد ضبط کی تھی۔ اور
پھر صرف ایک برس بعد گواہی کا حیلہ کر کے اس کو رہا کر دیا۔ تاکہ جائداد منضبطہ
واپس نہ دینی پڑے۔ اگر وہ بیچارہ جیسے اُس کی ایک برس بعد کی رہائی سے
ظاہر ہے بے قصور تھا۔ تو پہلے اِس شد و مد سے اس کی پچاس لاکھ کی جائداد
ضبط کر کے اس کو پھانسی کا حکم کیوں دیا تھا۔ اور اگر دراصل وہ بھاری قصوروار
تھا۔ اور صاحب سشن جج کے سب دلائل مندرجہ فیصلہ صحیح ہیں۔ تو اُس کو
ایک برس بعد کس واسطے رہائی کر دی؟ اِس کے بعد ۱۸۷۱ئہ تک جو جو
مقدمات گرفتاری وہابیاں مثل مقدمہ امیر خاں صاحب سوداگر جرم و مولوی
تبارک علی صاحب و مولوی امیرالدین صاحب ساکن پٹنہ ملک بنگال و ابراہیم
منڈل ساکن اسلام پور ہوتے رہے۔ تو یہی معمولی گواہ یا گویندہ جھوٹی گواہی
دینے کو بلائے جاتے تھے۔ اور میں نے خود ان میں سے ایک گواہ کی زبانی
سنا ہے۔ کہ جب کبھی خلاف گواہی دینے سے ہم نے انکار بھی کیا تو ہم کو یہہ

کہا گیا کہ تم لوگ شرطیہ طور پر فقط اسی گواہی دینے کے واسطے بطور گوئیندہ رہا کئے گئے ہو۔ اگر تم گواہی نہ دو گے تو پھر تم کو دائم الحبس کر کے پہلے ہی وارنٹ پر کالے پانی کو بھیج دیا جاوے گا۔

جب میں انبالہ جیل سے لاہور جانے کو تیار ہوا۔ تو میری بیوی بچے بھی میری ملاقات کو جیل پر آنے تھے جس دن میری ملاقات اُن لوگوں سے ہوئی ماہ رمضان تھا۔ اور میں روزے سے تھا جیل کے باہر ایک کوٹھری میں بہت دیر تک میری اُن کی بات چیت رہی۔ میرا گیروا لباس اور کمبل کا کرتہ اور پاؤں میں بیڑی دیکھ کر میرے اقربا بہت متعجب اور غمگین ہوئے۔ مگر میں نے اُن کی بہت تسلی کی۔ اور ایمان اور صبر کا مضمون اُن کو سمجھایا۔ اسی دن کوئی سوا برس کے بعد میں نے اپنے بیٹے محمد صادق کو بھی دیکھا تھا۔ وہ ایسا بڑھ گیا تھا۔ کہ میں نے مشکل سے اس کو پہچانا تھا یہ گویا اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ پھر دوبارہ میں نے اس کو اس دنیا میں نہیں دیکھا۔

سفر لاہور

۲۲ ؍ فروری ۱۸۶۵ء کو ہم جیل لاہور کو روانہ ہوئے۔ جو گیانہ گیروا لباس کالا کمبل اوڑھے ہوئے، بیڑی، ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ ہم منزل در منزل اور کوچ در کوچ لاہور کو چلے جاتے تھے۔ دو ایک گاڑیاں بھی ہمارے

ساتھ تھیں۔ بقدر تیس چالیس قیدیوں کے ہم جیل انبالہ سے روانہ ہوئے تھے
سب پا پیادہ چلتے تھے۔ جب کوئی تھک جاتا تو اس کو گاڑی پر بھی سوار کر لیتے
تھے۔ ورنہ سب کے سب پا پیادہ خلخال آہنی کو چھنچھناتے چلے جاتے تھے۔
خیر سوا برس کے بعد جو ہم نے باہر کی ہوا کھائی تو طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ اور
راستے میں جو چاہتے سو خرید کر کھاتے اور مولوی یحییٰ علی صاحب کی ہر دم مصاحبت
میں رہے۔ اس سبب سے ہم کو تو اس سفر میں بھی دن عید اور رات شب برات
ہو گئی تھی۔ اتفاق حسنہ سے جس دن ہم نیا گیروا لباس پہن کر اول منزل سے
روانہ ہوئے تو مہاراجہ مہندر سنگھ صاحب والئی پٹیالہ کی برات بڑی دھوم دھام
سے اسی راہ سے عین ہمارے آگے کو جنوب سے شمال کو جاتی تھی۔ اس
وقت سورج نکلتا تھا۔ فجر کا سہانا وقت اور اخیر فروری کے گلابی جاڑے تھے۔
ایک طرف سورج کی کرنوں میں برات کے سونا چاندی اور تاش بادلہ اور
ہیرہ مرصع کی چمک، دوسری طرف ہماری بیڑی ہتھکڑی کے لوہے کی دمک
ادھر دوشالوں اور کمخواب و بانات کا رنگ، ادھر ہمارے جوگیانہ لباس
اور کمبلوں کی سرخی اور سیاہی کا ڈھنگ، ادھر ہاتھی گھوڑوں کی ہنکار ادھر
ہماری بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار ایک دوسرے کے مقابل اس دنیائے
فانی کی عزت و ذلت اور کمی بیشی مدارج کا فرق عجب خوبی سے دکھلا رہی تھی۔
مگر افسوس کہ یہ راجہ غالباً جس نے ہم کو اس وقت بڑی چشم حقارت سے دیکھا ہوگا۔

میری واپسی ہند سے بہت برس پہلے راہی ملک بقا ہوا۔ جہاں امیر فقیر دونوں خالی ہاتھ جیسے آئے تھے ویسے ہی حاضر ہوتے ہیں۔ اور اس نے اس عروس دنیا سے جس کے واسطے اس قدر دھوم دھام تھی بہت ہی تھوڑا فائدہ اٹھایا ہم جو ایک مدت درازہ کے بعد جیل کی تنگ تاریک کوٹھڑیوں سے باہر میدان میں پہنچے۔ تو ہم کو بھی مہاراجہ پٹیالہ کے براتیوں کی خوشی سے کم خوشی نہ تھی۔ ہم ہرنوں کی طرح اڑے چلے جاتے تھے جن جن قیدیوں کے پاس کچھ نقد تھا اُن کا جو کچھ جی چاہتا تھا راہ میں خرید کر کھاتے اور خوشی مناتے چلے جاتے تھے۔ لدھیانہ پھلور جالندھر امرتسر ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ اخیر منزل پر لاہور میں شالامار باغ کے سامنے ہر کسی نے اپنا اپنا من بھر کر جو چاہا سو کھا لیا۔ کیونکہ جیل میں جاکر تو سوائے معمولی کھانے کے اور چیزیں ملنی محال بلکہ جرم ہیں۔ قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور کے دروازہ پر پہنچے۔ اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازہ جیل پر بٹھلا دیئے گئے۔ اول ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا۔ اُس نے پہلے ہمارے مقدمہ والوں کو بغور تمام دیکھا۔ اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے سب سے اول ہم لوگوں کو ملاحظہ کیا اور بڑے غصہ سے حکم دیا۔ کہ ایک ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بھجر دصدور اس حکم کے لوہا ہہ ڈنڈے آہنی سے گرفتار ہو گئے

اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان سے ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ ۵ گرہ سے زیادہ لمبا نہ تھا ڈال دیا گیا۔ یہ حکم از راہ تعصب فقط ہم ہی لوگوں کے واسطے تھا۔ اور تمام جیل بھر میں ہم نے کسی اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا، چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا۔ اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔

سنٹرل جیل لاہور

اِس جیل کے بیچ میں ایک برج اور اس کے چوگرد آٹھ علیحدہ علیحدہ بارکیں معہ صحن اور کارخانہ مشقت کے بنے ہوئے تھے۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ نے حکم دیا کہ اِس مقدمہ کے جتنے قیدی ہیں ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ بارکوں یا نمبروں میں رکھو تاکہ ایک دوسرے سے ملنے نہ پائے۔ اس دن ہم کو اپنے دوستوں سے جُدا ہونا اِس آہنی ڈنڈے سے بھی بڑھ کر شاق ہوا۔ مجھ کو نمبر اول میں جو سب سے زیادہ سخت تھا لے گئے۔ لیکن قریب ۶ بجے شام کے تائید غیبی سے یہ حکم پہنچا کہ یہ قیدی آمدہ جیل انبالہ بیماری والے جیل سے آئے ہیں۔ اُن کو دوسرے سب قیدیوں سے علیحدہ رکھنا چاہیے تاکہ اُن کی بیماری اِس جیل میں بھی نہ پھیل جاوے۔ سو وہی پہلا نمبر جہاں میں بند تھا اُن کے علیحدہ

رکھنے کے واسطے تجویز ہو کر ہمارے کل ساتھی بلکہ سارا چالان اسی بارک میں جمع ہو گیا۔ تب ہم آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے اور اس حکمت الہٰی اور اسرار مکنونہ پر سجدہ شکر بجا لائے بوجہ ہونے ایک مسلمان جمعدار اس نمبر کے ہم کو کچھ مشقت بھی نہ کرنی پڑی۔ بلکہ بفضل الہٰی ایک ہفتے کے بعد اس سپرنٹنڈنٹ نے خود مجھ کو اسی نمبر کا منشی کر دیا۔ مگر وہ ڈنڈا جو غالباً کسی بڑے حاکم کے حکم سے تھا بدستور زیب پا رہا۔ جس کے سبب سے جب ہر گجر کو صاحب سپرنٹنڈنٹ وہاں تشریف لاتے۔ تو مجھ کو ہر قیدی کی مشقت کا حساب دکھلانے کے واسطے مثل ہرن کے اچھل اچھل کر اُن کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ ایک اِتوار کے دن اسی جیل لاہور میں اپنے بسترہ پر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ناگہاں صاحب سپرنٹنڈنٹ ہمارے نمبر میں پہنچے۔ اور کل قیدیان نمبر کی تلاشی کرنے کا حکم جاری کیا۔ یکے بعد دیگرے میرے بستر کی بھی تلاشی ہوئی جس میں کچھ تھوڑا سا پسا ہوا نمک میرے بسترہ سے بھی برآمد ہو گیا۔ ایسے قصور پر وہاں بیت کی سزا ہوتی ہے۔ جب یہ نمک برآمد ہو کر سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش ہوا تو میں حیران تھا کہ کیا جواب دوں۔ اس میں صندل نام ایک مسلمان قیدی جو جیل انبالہ سے میرے ساتھ آیا تھا اور میری خدمت کرتا تھا بول اُٹھا کہ یہ بسترا اور نمک تو میرا ہے مولوی صاحب کا نہیں ہے۔ تب صاحب سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا یہ کیسے بات ہے اس نے کہا کہ حضور کے تشریف لانے سے پہلے میں اور

مولوی صاحب دونوں پیشاب کرنے کو پاخانہ میں گئے تھے۔ اِس بیچ میں حضور آگئے۔ ہم جلدی سے جو دوڑ کر آئے۔ اِس گھبراہٹ میں یہ میرے بستر پر اور میں اُن کے بستر پر بیٹھ گئے۔ صاحب سپرنٹنڈنٹ اِس بیان کو سُن کر بہت ہنسا۔ اور بولا کہ تم مولوی کو بچانا چاہتے ہو۔ اِس کے بعد ہم دونوں کو نمبر سے باہر جہاں بیت لگا کرتے تھے لے گیا۔ دوسرے قیدیوں کو جن کے بستروں سے کچھ کچھ نکلا تھا۔ بیت لگنے شروع ہوئے جب دوسرے قیدیوں کو بیت لگ چکے تو اخیر میں پھر اُس نے ہماری طرف متوجہ ہو کر صندل مذکور سے پوچھا کہ یہ بات سچ ہے کہ یہ بستر اور نمک تمہارا ہے۔ اور مولوی کا نہیں ہے؟ اس نے کہا ہاں! نمک اور بستر تو میرا ہے آگے آپ کو اختیار ہے۔ یہ جواب سُن کر اس نے ہم دونوں کو بَری کر دیا اور کچھ سزا نہ دی۔ اور صندل سے کہا کہ اچھا تم مولوی کو بچانا چاہتے ہم نے تم کو بھی معاف کیا۔ جاؤ آگے سے ہوشیار رہو۔

روانگی کراچی

اخیر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں ایک بڑا بھاری چالان قیدیوں کا تیار ہو کر ملتان کو روانہ کرنے کا بندوبست ہوا۔ ایک ایک ہتھکڑی دو دو آدمیوں کے ہاتھوں میں لگائی گئی۔ میرے ساتھی نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ میرا

بایاں اور اپنا دہنا ہاتھ ہتھکڑی میں ڈلوایا۔ ہمارے مقدمہ کے فقط تین
آدمی یعنی میں اور مولوی یحییٰ علی صاحب اور میاں عبدالغفار صاحب ملتان کو روانہ
ہوئے۔ جس دن ہم لاہور سے روانہ ہوئے۔ ریل کے اسٹیشن تک پاؤں میں
بیڑی سر پر بستره جس کو ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں
ہتھکڑی کی گلجوٹ اس پر سپاہیوں کی مار مار کہ جلدی چلو جلدی چلو ریل چلے جائیگی
خیر بہر صورت ہم ریل تک پہنچے۔ وہاں جا کر ریل کی کوٹھڑیوں میں ہم کو بند
کر کے قفل لگوا دیا۔ اور لاہور سے ملتان تک راہ میں کہیں نہ کھولا۔ مثل جانوروں
یا مال گاڑیوں میں بھر دیا تھا۔ کوئی آٹھ بجے رات کے بعد ہم ملتان پہنچے۔ وہاں
بھی اندھیری رات میں سر پر بستر رکھے ہوئے کشاں کشاں اسٹیشن سے جیل
تک پہنچے۔ جہاں بے آب و دانہ مثل جانوروں کے رات کو بند کر دیئے گئے۔
دو دن ہم جیل ملتان میں رہے۔ شہر کدھر بستا ہے۔ بازار کہاں ہے؟ وہ
ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھا دو روز بعد وہاں سے لیجا کر ایک پتن یا گھاٹ
دریائے سندھ پر جو ملتان سے قریب پانچ کوس ہے۔ ہم کو اگنبوٹ پر سوار
کرایا۔ سوار کر لینے کے بعد ہم سب کو قطار بہ قطار کر کے اس پر بٹھلا دیا۔ اور
سوائے بیڑی اور ہتھکڑی اور ڈنڈے کے جو پہلے سے زیب تن تھے یہاں
ایک بڑی موٹی زنجیر آہنی بھی ہماری بیڑیوں کے بیچ میں پھنسائی گئی کہ جس سے
اپنی اپنی جگہ سے کوئی ہل نہیں سکتا تھا۔ جب تک ہم جہاز پر رہے۔ اپنی اپنی

جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے۔ اُس وقت قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود اس قدر پانی کی کثرت کے کہ دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا۔ ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے۔ گو ہم جکڑے ہوئے پڑے تھے مگر جیل سے نکل کر اور دوستوں کی مصاحبت اور آب دریا کی روانی اور آس پاس کے جنگلوں کی سبزی کو دیکھ کر بہت بشاش تھے۔ اس کیفیت سے ہم پانچ چھ روز بعد کوٹلی میں پہنچ گئے۔ سکھر بکھر اور ٹھٹھے کا نامی قلعہ بھی ہم کو راہ میں سندھ کے کنارے پر ملا تھا۔ کوٹلی کے سامنے دوسرے کنارہ دریائے سندھ پر حیدرآباد سندھ کی نامی بستی بھی دیکھنے میں آئی۔ کوٹلی سے اسی دن ریل پر سوار ہو کر ہم کراچی میں پہنچ گئے۔ اس ملک میں بڑی بڑی اونچی ٹوپیاں منشی اور کلرک اور بڑی بڑی پگڑیاں ہندو مہاجن پہنتے ہیں۔ جب ہم جیل انبالہ سے روانہ ہوئے تو ہمارا خیال تھا کہ انگریزی عملداری میں سب جگہ اُردو یا فارسی کا دفتر ہوگا۔ اور جہاں کہاں اپنی منشی گری کے ہر جگہ محرّری کے کام میں رہ کر قید میں بھی آرام سے رہیں گے اس خیال باطل کے ساتھ فضل الٰہی کا ہم کو وہم بھی دل میں نہ گذرا تھا۔ مگر بخلاف ہمارے خیال کے اُردو فارسی کا دفتر ملتان میں ختم ہوگیا تھا۔ ملک سندھ میں سب سندھی زبان کا دفتر دیکھا گیا۔ سندھی علم کے حروف تو فارسی کے ہیں۔ مگر زبان سندھی ہونے کے سبب ہم کو ایک لفظ بھی سمجھنا دشوار رہے۔ ملک سندھ سے ہم ناخواندوں میں شمار ہونے لگے۔ اور وہ غرور منشی گری اور

بھروسہ غیر اللہ خود بخود دل سے دور ہو گیا۔ الحمد اللہ کہ کراچی کے جیل میں پہنچنے کے ساتھ ہی ہماری ہتھکڑی اور آڑے ڈنڈے سے تو نجات ہوئی۔ فقط بیڑی آہنی زیب تن رہی۔ بمقابلہ دوسرے جیلخانوں کے جہاں جہاں یہ خاکسار رہا کراچی کے جیل کو جیل کیا ایک عمدہ مہمان سرا کہنا چاہیئے۔ وہاں رات کو قیدیوں کو بارک یا کوٹھڑیوں میں مثل جانوروں کے بند نہیں کرتے۔ بنگلوں کی طرح سے کھلے ہوئے مکان اور چٹائیوں کا فرش بچھا ہوا قیدیوں کے واسطے موجود ہے۔ رات کو جہاں چاہو پھرو۔ جہاں چاہو سوؤ کوئی مانع نہیں۔ پہرے دار لے فقط جیل کی فصیل پر پھرتے ہیں۔ رات کو جیل کے اندر محافظ یا پہرہ دار کا نام نہیں۔ دو برس کے بعد یہاں رات کو آسمان اور ستاروں کی زیارت بھی ہم کو نصیب ہوئی۔ جناب باری میں سجدات شکر بجا لائے۔ یہاں قیدیوں کا کھانا بھی بہ نسبت اور جیلخانوں کے نہایت عمدہ تھا۔ گیہوں کی روٹیاں گھی سے چپڑی ہوئی اور عمدہ ترکاری اور گوشت غرض دو وقتہ پیٹ بھر کھانا یہاں قیدیوں کو ملتا ہے۔ مگر پاخانہ پھرنے کی بڑی دقت تھی کیونکہ چوبی پیپوں کو میدان میں رکھوا دیا ہے جس کے اوپر بدشواری چڑھ کر تن برہنہ سب کے سامنے قیدی پاخانہ پھرتے ہیں

بمبئی

ایک ہفتہ کراچی میں ٹھیر کر ایک بادبانی جہاز پر جس کو بگلہ کہتے ہیں ہم سوار ہوئے

سب سے پہلے سمندر اور جہازوں کی زیارت ہم نے کراچی میں کی۔ یہ جہاز بہت چھوٹا تھا۔ مگر قیدیوں کو مثل بورہ مال کے پیچے کی تہ میں اوپر نیچے کر کے بھر دیا تھا۔ قیدی گھچم گھچ ایک دوسرے کے اوپر نیچے پڑے تھے۔ اور یہ بیت پڑھتے تھے ؎

جائے تنگ است و مرد ماں بسیار
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

جب لنگر اٹھا کر تھوڑی دور سمندر میں جہاز پہنچا۔ تو دریا کے تلاطم اور امواج سے جہاز ہلنے لگا۔ اور قیدیوں کو تے متلی شروع ہوئی۔ تنگی جگہ کے سبب سے ایک دوسرے پر تے کرتا جاتا تھا اس جہاز پر کچھ مسلمان خلاصی تھے۔ جنھوں نے ہم کو مولوی سمجھ کر حتی المقدور خود کھانے پینے سے بہت تواضع کی۔ خیر دو تین روز کے بعد بمشکل تمام ہم داخل بندر بمبئی کے ہوئے۔ وہاں دیکھا تو کوسوں تک ہزاروں جہاز کھڑے تھے اس کو ایک جہازوں کا جنگل کہنا چاہیئے زیر قلعہ بمبئی کے ڈونگیوں میں بٹھلا کر ہم کو جہاز سے اتارا اور وہاں سے بذریعہ سواری ریل جیلخانہ تھانہ کو جو بمبئی سے دس بارہ میل ہے ہم کو لے گئے۔ بمبئی میں پارسی مرد عورتوں کو ہم نے پھرتے ہوئے دیکھا۔ اس قوم کے لوگ بہت خوبصورت گورے رنگ کے ہوتے ہیں اور مالدار بھی ہیں۔ یہ لوگ آتش پرست زرتشت کی امت سے ہیں۔ خلیفہ دوم کی چڑھائی کے

وقت ایران سے بھاگ کر اس حصہ ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ بمبئی کی عمارات جہانتک ہم کو دیکھنے کا موقع ملا۔ نہایت اونچی اور دیواروں میں بے شمار کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ بمبئی شہر بھی ایک ٹاپو ہے۔ ایک بند باندھ کر اس کو براعظم ہند سے ملا دیا ہے۔ بمبئی اور تھانہ کے بیچ میں بھی سمندر رہتا ہے۔ اور اس کے پانی کو کھیت اور کیاریوں میں روک دیتے ہیں۔ دھوپ کی تپش سے وہ کھارا پانی خشک ہو کر عمدہ نمک خود بخود تیار ہو جاتا ہے۔ ہزاروں من نمک کے انبار ریلوے سڑک کے دوسرے کنارے لگے ہوئے تھے۔ ناریل کے درخت اور تازہ پھل بھی ہم نے پہلے پہل بمبئی میں دیکھا۔ یہاں کی عورتیں اپنی ساڑھی کو مثل مردوں کے دھوتی کے طور پر پیچھے کی طرف ٹانگ لیتی ہیں۔ گھٹنے کے اوپر تک۔ اور آدھی پنڈلیاں کھلی رہتی ہیں۔ یہاں کے ہندوؤں کی پگڑیاں بھی بہت بڑی لمبی سر پر ٹوکرا سا رکھا رہتا ہے۔ اس ملک کی زبان گجراتی یا مرہٹی ہے۔ جب ہم ریل سے اتر کر تھانہ کے بازار میں جیل کی طرف پا پیادہ چلے جاتے تھے۔ تو ہمارے ساتھی قیدیوں نے چند مٹھائی والوں کی دوکانوں کو لوٹ لیا۔ اور بے محابا اس مال مسروقہ کو کھانے لگے۔ بیچارے دوکاندار ان کو قیدی سمجھ کر چپ ہو رہے بلکہ ہم نے دیکھا کہ بعض دوکاندار اپنی مٹھائی لٹا کر بہت خوش ہوئے۔ اور قیدیوں کے منہ میں پڑنے کو بڑا پن سمجھے۔

——— (✱) ———

تھانہ جیل

چلتے چلتے قریب شام کے ہم تھانہ کے جیل کے دروازہ پہنچے۔ جیل کیا ایک مرہٹوں کے وقت کا بڑا مستحکم اور مضبوط قلعہ ہے۔ جس کے چاروں طرف ایک بڑی گہری پختہ خندق بنی ہے۔ جیل کے اندر داخل ہونے کے ساتھ ہی ہماری تلاشی شروع ہوئی۔ اور ہم سب کی جوتیاں اُتروالی گئیں۔ اور پھر چلتے وقت واپس ملیں۔ سُنا ہے کہ ایک دفعہ کسی دل جلے قیدی نے داروغہ جیل کو جوتیوں سے مارا تھا۔ اُس وقت سے یہ قانون یہاں ہوگیا کہ قیدی جیل میں جوتا نہ پہنے اور ننگے پاؤں پھرا کرے۔ تاکہ دوبارہ ایسی نامعقول حرکت نہ کرے۔ رات کو دو دو جوار کی روٹیاں اور تھوہر کی دال دے کر علیحدہ علیحدہ کوٹھریوں میں ہم کو بند کر دیا۔ مگر بتائید الہیٰ دوسرے دن سے پنجابی قیدیوں کو گندم خور ملک کے آدمی سمجھ کر گیہوں کی روٹیاں ملنے لگیں۔ اور ہمارے بعد سے یہ خصوصیت کل چالان آمدۂ پنجاب کے واسطے ہمیشہ کے لئے مقرر ہو گئی۔ فجر کو ہمارے سب چالان کو پتھر توڑنے کی مشقت دی گئی جس کو بمشکل تمام ایک دو دن کیا۔ دو روز بعد ہمارے پہنچنے سے وہاں دری بافی کا کام شروع ہو گیا۔ اور ہمارے چالان کے پنجابی قیدی اُس کے مہتمم مقرر ہو گئے۔ مگر انھوں نے مجھ کو اور مولوی یحییٰ علی صاحب کو دری بافوں کا استاد بیان کر کے اپنے ساتھ لے لیا جہاں

ہمارا ایک مہینہ بڑے آرام کے ساتھ سے ہوا۔ اس جیل اور ملک میں مرہٹی زبان کا دفتر ہے فارسی اور اُردو خواں یہاں بھی ناخواندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اب کراچی اور تھانہ کے دفتروں کا یہ حال دیکھ کر ہم کو تو یقین ہوگیا تھا کہ اب ہم باقی عمر ناخواندوں میں شمار ہوں گے۔ اور قلم پکڑنے کی نوبت شاید ہی آئے وہ اُمید جو ہم کو فن منشی گری سے تھی قطع ہوگئی۔ اب فقط فضل الٰہی کی اُمید باقی رہ گئی۔ اس جیل کا بڑا جیلر یا داروغہ تو ایک ہی بڑا دماغ آدمی تھا۔ مگر ابراہیم نام ایک مسلمان نائب داروغہ حتی المقدور خود ہماری بہت خاطرداری کرتا تھا اب ایک مہینہ رہنے کے بعد یہاں سے بھی ہمارے چلنے کی تیاری ہوئی اس مسلمان نائب داروغہ نے چلتے وقت ہماری بھاری بیڑیاں نکلوا کر برائے نام ہلکی ہلکی بیڑیاں ڈلوادی تھیں ہند کے جیلوں میں دیسیوں کو خصوصاً شریفوں کو بڑی مشکل ہے۔ نہ کھانے کپڑے کا بندوبست ہے نہ پاخانے کا۔ رات کو ہر موسم میں بارکوں میں مثل جانوروں کے بند کر دیتے ہیں۔ بدمعاشوں کو البتہ آرام ہے۔ ہمارے دیسیوں کے مدارج کا کچھ لحاظ نہیں۔ کالے کالے سب ایک سمجھ کر راجہ نواب، مہتر، چمار سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ مگر کوٹ پتلون والوں کی وہاں بھی بڑی عزت ہے۔ یورپین دوغلے دونوں مثل صاحب لوگوں کے وہاں بھی چین کرتے ہیں۔

کالا پانی کو روانگی

واقعہ ۸ ہر دسمبر ۱۸۶۵ء بسواری جہاز جمنا ہم بمبئی سے کالے پانی کو روانہ ہوئے۔ یہ جہاز ولایت انگلینڈ کا تھا۔ اس کے کل خلاصی اور افسر گورے تھے۔ ہندوستانی بات کوئی نہ جانتا تھا۔ موتی لال بابو ایک انگریزی دان قیدی اس جہاز پر ہمارے ساتھ تھا۔ اُس کی معرفت سے جہاز والوں سے ہم کچھ بات چیت کیا کرتے تھے۔ مجھ کو تو اس وقت ایک انگریزی بات بھی معلوم نہ تھی۔ جہاز پر دال بھات اور سوکھی مچھلی مسلمانوں کی خوراک تھی۔ اور ہندوؤں کو چبینا ملتا تھا ہمارے ساتھی پنجابیوں کو جو ہمیشہ روٹی کھانے کے عادی تھے، مہینہ بھر دو وقت چاول کھانے سے بڑی تکلیف ہوئی۔ جب جہاز سمندر میں پہنچا تو طوفان اور تلاطم سے ہلتا تھا۔ اکثر آدمی قے، متلی سے بیمار ہو گئے۔ ایک پنجابی قیدی میعادی ہفت سالہ جس کے صرف پانچ برس اُس وقت باقی رہ گئے تھے بیمار ہو کر جہاز پر مر گیا۔ ہم لوگوں نے موافق قاعدہ شریعت کے اس کو غسل اور کفن دے کر اور جنازہ کی نماز پڑھ کر اس کی لاش کے ساتھ بہت سے پتھر باندھ کر سمندر میں چھوڑ دیا۔ ہمارے محافظ مرین پلٹن کے سپاہی جو بمبئی سے ہمارے ساتھ آئے تھے ہم لوگوں پر بہت مہربانی کیا کرتے تھے۔ جب سیلون

یا لنکا کے برابر ہمارا جہاز پہنچا۔ تو سمندر میں بہت تلاطم معلوم ہوا۔ وہ ہزاروں من کا جہاز مثل گیند کے پانی پر اچھلتا تھا۔ کبھی سمندر کا پانی پہاڑ کی طرح ایک طرف سے آتا۔ اور کبھی جہاز نیزوں نیچے پانی میں چلا جاتا۔ ۲۴ روز کے سفر دریائی کے بعد ۱۱ ۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو ہمارا جہاز قبل از دوپہر پورٹ بلیر انڈمان میں پہنچا۔ انبالہ سے چل کر گیارہ مہینے کے بعد ہم داخل انڈمان ہوئے۔

انڈمان

دور سے سمندر کے کنارے کالے کالے پتھر ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا بھینسوں کے جھنڈ کے جھنڈ پانی میں پھر رہے ہیں۔ لنگر ڈالنے کے تھوڑی دیر بعد محافظ بندر پورٹ بلیر ایک کشتی میں سوار ہو کر جہاز پر آئے اُس کے ایک ہندوستانی ملاح سے میں نے پوچھا کہ یہاں کچھ منشی محرروں کی بھی قدر ہے اور دفتر کس زبان میں ہے؟ وہ شخص قرینہ سے مجھ کو منشی معلوم کر کے میری تسلی کے واسطے مبالغہ کر کے بولا کہ یہاں کے حاکم اور مالک تو منشی ہی ہیں۔ وہ جو چاہیں سو کریں۔ خیر اس ناامیدی پر جو کراچی اور تھانہ میں ہوئی تھی یہ مژدہ سن کر کسی قدر تسلی ہوئی۔ پھر بڑے بڑے بوٹ اور کشتیاں کنارے سے آئیں اور ہم کو سوار کر کے رَوس نام ٹاپو صدر مقام انڈمان میں لے گئے

جب ہم کنارے کے نزدیک پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ بیسیوں منشی اور مولوی سفید اور فاخرہ لباس پہنے ہوئے ہمارے منتظر کھڑے ہیں۔ ابھی ہم کشتی میں سوار تھے کہ ایک آدمی نے کنارہ پر سے بہ آوازِ بلند پوچھا کہ محمد جعفر اور مولوی یحییٰ علی صاحب بھی اِس جہاز میں آئے ہیں؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں! وہ دونوں آئے ہیں۔ میرا جواب سُن کر وہ لوگ پانی میں کو دپڑے اور ہم لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ کشتی سے نیچے اتار لیا۔ نیچے اُتر کر ہم کو یہاں معلوم ہوا کہ مولوی احمد اللہ صاحب ہم سے ایک برس بعد پٹنہ میں قید ہو کر ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو ہم سے چھ مہینے پہلے پورٹ بلیر میں پہنچ گئے۔ اور ایک دوسرے جہاز کے قیدیوں سے جو ہم سے اول اسی جیل تھانہ سے چل کر فقط دو روز پہلے ہم سے پہنچے تھے ہماری آمد کا حال معلوم کر کے مولوی صاحب ہمارے منتظر تھے اور یہ سب لوگ اُنہیں کے اِشارے پر ہمارے لینے کو گھاٹ پر آئے تھے۔ خیر ہم لوگ بوٹ سے اُتر کر اسی مجمع کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کرتے ہوئے اپنے چالان کے قیدیوں سے جُدا ہو کر منشی غلام نبی صاحب محرر مرین ڈیپارٹمنٹ کے مکان پر پہنچے۔ وہاں مولوی احمد اللہ صاحب اور دوسرے اکثر معزز لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ اور اسی مکان میں ہم تینوں آدمی رہنے لگے اسی دم ہماری بیڑی کٹوا دی اور عمدہ لباس جو ہمارے واسطے تیار کر کے رکھا تھا ہم کو پہنایا گیا۔ اور تمام جلسہ کے ساتھ ہم نے دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور اس تاریخ سے تا ایں دم کبھی ہم نے پھر بازاری لباس یا

کھانا قیدیوں کا کبھی نہیں دیکھا۔ گو اسی تاریخ سے ہم قید سے رہا ہو گئے۔ گو اٹھارہ برس تک مثل ملزمان کالے پانی میں رہے۔ اسی شام سے گھر گھر ہماری دعوتیں ہونے لگیں اور وہ وہ نفیس اور عمدہ کھانے ہم کو کھلائے گئے کہ ہند میں مجھ کو تو کبھی ایسے کھانے نصیب بھی نہ ہوئے تھے۔ وہ ہمارا خیال کہ اب ہم کو ساری عمر صرف جیل کا کھانا کھانا پڑے گا۔ اس قادر مطلق نے بذریعہ اس نعم البدل کے ہمارے دل سے قلع قمع کرا دیا اور اپنی قدرت کو دکھلا دیا۔ جب ہم اس جزیرے میں پہنچے۔ تو ہزاروں مرد عورت قیدیوں کو دیکھا کہ ماتھا اُن کا کھود کر پیشانی پر اُن کا نام اور جرم اور لفظ دائم الحبس لکھا ہوا ہے کہ وہ نوشت مثل نوشتۂ تقدیر کے تمام عمر نہیں مٹتی۔ مگر یہ تائید الٰہی سینئے کہ ہمارے پہنچنے سے کچھ عرصہ پہلے وہ حکم ماتھا کھودنے کا تمام علداری سرکار سے ہمیشہ کے واسطے موقوف ہو گیا تھا اس سبب سے اس داغ دائم الحبسی سے بھی ہم محفوظ رہے۔

جزائر انڈمان خلیج بنگال کے مشرق کو ۹۲ درجہ ۴۷ دقیقہ طول شرقی اور ۱۱ درجہ ۳۴ دقیقہ عرض شمالی پر کلکتہ سے قریب ۶۰۰ میل کے واقعہ ہیں یہ مجموعہ جزائر ۶۴۷ میل کے گھیرے میں جس میں قریب ایک ہزار جزیروں کے شامل ہیں بنام انڈمان مشہور ہے۔ علم طبقات الارض کے محققوں کا یہ قول ہے کہ یہ جزائر کسی زمانہ میں براعظم ایشیا سے ملے ہوئے تھے۔ پھر طلاطم کے پھیر پھار اور سمندر کی موجوں سے کٹ گئے اول یہ ٹکڑا براعظم ایشیا سے

علیحدہ ہوگیا تھا اور پھر آخر کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہوتے ہزاروں
چھوٹے چھوٹے جزیرے ہوگئے۔ یہاں پانچ روز میں کلکتہ سے اگنبوٹ
پہنچتا ہے۔ اور تین روز میں رنگون سے۔ مولمین یہاں سے تین سو میل مشرق
وشمال میں اور سنگاپور چار سو میل گوشۂ مشرق وجنوب میں اور پناننگ تین سو پچاس
میل مشرق میں اور نکوباریا ننکوڑی اسی میل جنوب میں اور مدراس آٹھ سو میل
مغرب اور لنکا آٹھ سو میل گوشۂ مغرب وجنوب میں واقع ہیں۔ یہ جزائر سب
پہاڑ ہیں۔ ہموار زمین بہت کم ہے۔ یہاں سب سے اونچا پہاڑ مونٹ ہریٹ
کا ہے جو سطح سمندر سے ۱۱۱۶ فٹ اونچا ہے۔ میٹھے پانی کا کوئی ندی نالہ یہاں
جاری نہیں ہے۔ برسات کے موسم میں بعض اونچے ٹیکروں اور ٹیلوں سے
پانی کے جھرنے بہا کرتے ہیں لیکن ایام خشکی میں بند ہو جاتے ہیں۔ کوئیں اور
ڈگیاں یہاں بکثرت ہیں یہاں کے جوائر میں پورٹ بلیر کے اتر کو ایک گندھک
کا پہاڑ ہے۔ اس سے ہر وقت آگ کے شعلے نکلا کرتے ہیں۔ یہاں کے
جنگل میں سوائے سور کے اور کوئی چوپایہ درندہ یا چرندہ نہیں ہے۔ لعاب
ابابیل یہاں کا ایک عمدہ تحفہ ہے قوت باہ کے واسطے ماہی سقنقور سے بڑھکر
سمجھا جاتا ہے۔ اور بہت گراں مثل نقرہ اور طلاء کے بکتا ہے۔ یہاں کے جنگلوں
میں ہزاروں قسم کی عمدہ اور پائدار لکڑیاں موجود ہیں مگر ہمارے ملک کی
لکڑیوں سے سراسر غیر ہیں۔ بید بھی یہاں کے جنگلوں میں کئی قسم کا ہے اور

اس کی کیٹریاں بطور تحفہ کے ملک ملک کو جاتی ہیں۔ عقیق البحر کی چھڑیاں مثل
کالی ناگنی کے اور سنکھ اور ہزارہا قسم اور رنگ برنگ کی کوڑیاں اور طرح طرح
کی سیپیاں یہاں کے سمندر سے نکلتی ہیں اور ملکوں کو بطور تحفہ کے جاتی ہیں
آم۔ املی۔ جامن۔ کٹھل۔ بڑہل۔ جائفل۔ ناریل اور پان وغیرہ کے درخت
جو گرم ملکوں کے جنگلوں میں ہوتے ہیں۔ یہاں سب خودرو موجود ہیں۔ اب
جنگل کے صاف ہوجانے سے پچاس سو گاؤں بھی یہاں آباد ہوگئے ہیں۔ اور
ہر قسم کی ترکاری اور گرم ملکوں کے پھل اور دھان اور مکئی جوار و مونگ و ماش
و اوکھ یعنی نیشکر وغیرہ کثرت سے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر گیہوں چنا وغیرہ
ربیع اور سرد ملکوں کے اناج یہاں بالکل پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن سرکار گیہوں
چنا وغیرہ کلکتہ سے لاکر بحساب سات پائی فی پونڈ یعنی سوا آنہ سیر کے فروخت
کرتی ہے۔ اس سبب سے اس ملک میں کبھی قحط نہیں پڑتا۔ ہمیشہ ایک ہی نرخ
سے غلہ بکتا ہے۔ آب و ہوا اس جزیرے کی اب تو ایسی عمدہ اور صحت بخش
ہے کہ اس کا ثانی بردۂ زمین پر کوئی مکان نہیں ہے۔ ہیضہ اور چیچک اور وبائی
بخار اور آشوب چشم کے متعدی امراض بالکل نہیں ہیں۔ بیس برس میں ہم نے
کبھی ایک بیمار بھی ان بیماریوں کا نہیں سنا۔ نہ یہاں سر اور کپڑوں میں جوئیں
پڑتی ہیں۔ اور نہ دوسرے موذی جانور مثل پسو اور مچھر کے ہوتے ہیں۔ خط استوا
کے قریب ہونے کے سبب سے ہمیشہ بارہ مہینے یہاں دن رات برابر ہوا کرتا ہے

بہت ہی تھوڑا فرق پڑتا ہے۔ سردی گرمی یہاں دونوں نہیں ہمیشہ یہاں ہمارے
ملک کے چیت بیساکھ کی کیفیت رہتی ہے۔ دسمبر جنوری میں رات کو ایک یا دو
اوڑھنے کی نوبت آتی ہے نہ گرمی میں گرمی ہوتی ہے نہ لو یہاں چلتی ہے بڑے
کپڑوں کا یہاں بالکل دستور نہیں۔ نہ کوئی رضائی بناتا ہے نہ دلائی۔ نہ یہاں
روئی ہے نہ دھنیا۔ یہاں نہ کبھی موسم خزاں ہے نہ بہار۔ بارہ مہینے درخت
ہرے بھرے رہتے ہیں۔ غالباً یہاں کا موسم برعایت حال جنگلیوں کے جو
ننگے مادرزاد پھرتے ہیں۔ اُس حکیم اور علیم نے بنائی ہے۔ اگر سردی یا گرمی ہو تو
وہ ننگی مخلوق فوراً ہلاک ہو جاوے۔ یہاں بارش کی بہت کثرت ہے۔ مئی
سے نومبر تک آٹھ مہینے برابر رات دن برستا رہتا ہے۔ اسی سبب سے
یہاں کے مکانوں کی چھت ڈھلویں ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی کبھی کچی
اور چپٹی چھت اُس بارش کا ایک دن بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اولے یہاں
کبھی نہیں پڑتے۔ نہ کبھی آندھی چلتی ہے۔ جنگل نہایت گنجان اور دشوار
گزار ہے۔ درخت اتنے اونچے ہیں کہ گویا آسمان سے باتیں کر رہے ہیں
جب کسی درخت کو کاٹ کر گراتے ہیں تو سینکڑوں گز تک اُس کی ڈالیاں
اور شاخوں کا اثر پہنچتا ہے۔ یہاں کے سانپ اور بچھو میں زہر نہیں۔ لیکن
یہاں ہزار پایہ بہت زہریلے ہوتے ہیں۔ یہاں کے جنگل میں قدیم سے
ایک وحشی ننگی مادرزاد قوم رہتی ہے۔ مرد عورت کپڑا کوئی نہیں پہنتے اور نہ

پڑا اُن کو میسّر آتا ہے۔ اِن جنگلیوں کا صحیح حال اب تک معلوم نہیں ہوا کہ کب اور کس ملک سے آکر یہاں آباد ہوئے اور ہمیشہ سے ایسے ہی وحشی ہیں یا کبھی مہذب بھی تھے یا نہیں۔ یہ جنگلی جیسا کہ مشہور تھا آدم خور نہیں ہیں نہ اُن کے بدن پر بال ہیں۔ قریب سو برس کے ہوئے سب سے اول لفٹنٹ بلیر ایک جہازی سردار نے یہاں آکر لنگر ڈالا تھا اِسی سبب سے اِس جزیرے کا نام پورٹ بلیر ہوا۔ انہیں ایام میں جس کو سنتر برس ہوئے سرکار نے پہلے بھی یہاں قیدیاں حبس دوام کا رکھنا تجویز کیا تھا۔ مگر ناموافقتی آب و ہوا کے سبب سے ۱۷۹۶ء میں یہ جزیرہ آباد ہو کر پھر اُجڑ گیا تھا ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد سرکار کو پھر اس کی ضرورت ہوئی اور مارچ ۱۸۵۸ء سے گویا دوبارہ اِس کی آبادی شروع ہوئی۔ اور پہلے پہل بغاوت کے قیدی یہاں لاکر رکھے گئے۔

انڈمن کے اصلی باشندے

شروع آبادی میں مدت تک جنگلی لوگ سخت مخالف رہے۔ چنانچہ دو مرتبہ انھوں نے ڈاکٹر واکر صاحب سپرنٹنڈنٹ اوّل کے عہد میں بڑی بھاری جنگلیوں کی فوج جمع کر کے ایک دفعہ ہدوپہ دوسری بار

ابرڈین پر حملہ کیا۔ آخر لڑائی اور حکمت عملی سرکار سے وہ فرمانبردار ہو گئے۔ اور اب جنگل یا بستی میں جہاں کہیں وے ملتے ہیں تو نہایت خاطرداری سے پیش آتے ہیں۔ گو شروع آبادی میں اِن وحشیوں نے بہت خون خرابے کئے تھے۔ یہ لوگ چار فٹ سے پانچ فٹ چار انچ تک اونچے مثل حبشیوں کے سیاہ فام۔ گول سر۔ آنکھیں اُبھری ہوئی۔ سر پر بھیڑ کے سے بال مگر نہایت مضبوط اور قوی ہوتے ہیں۔ اِن کل جزائر انڈمان میں اُن کی بارہ ذاتیں ہیں۔ ایک ذات کی زبان دوسری قوم سے بہت کم ملتی ہے یہ جنگلی اِس بات کے قائل ہیں کہ خدا آسمان میں رہتا ہے وہی خالق ہر شے کا ہے اور سب سے بڑا ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا محل بہت عمدہ اور نفیس آسمان میں ہے اس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا اُسی کے گھر سے پانی برستا ہے۔ بجلی کا شعلہ اور کڑک بھی اُسی کے پاس سے آتی ہے۔ موت بھی اُسی کے حکم سے ہوتی ہے۔ بھلائی اور روزی بھی وہی دیتا ہے۔ مسماۃ چانا پالک ایک اس کی جورو بھی ہے۔ اس کی جورو کو بھی فنا نہیں اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوئی۔ مگر اس کا درجہ خدا سے کم ہے اس کا کام ہے کہ سمندر میں مچھلیاں پیدا کرے۔ وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔ یہ لوگ شیطان کے بھی قائل ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ سب بُرے کام شیطان کراتا ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں بس

شیطان دو ہیں۔ ایک زمین کا شیطان جس کا نام ارم چوگلا ہے جب کوئی زمین پر ناگہانی موت سے مرجاتا ہے تو یہ سمجھتے ہیں کہ ارم چوگلا نے مار ڈالا ہے ایک سمندر کا شیطان ہے جس کا نام جورو ونڈا ہے۔ جب کوئی آدمی ڈوب کر مرجاتا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ اس کو جورو ونڈا نے مار ڈالا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں کے بھی قائل ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ مرد عورت دونوں جنس سے ہیں اور جنگل میں رہتے ہیں اور انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھوت پریت کے بھی قائل ہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ ان کو کچھ اختیار نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا یا غیر خدا کسی چیز کی پوجا نہیں کرتے۔ یہ لوگ طوفان نوح کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک بار زمین پر ایسا طوفان آیا تھا کہ ساری دنیا ڈوب گئی تھی اور ان جنگلیوں کے بزرگ ایک کشتی بنا کر اس پر سوار ہوگئے تھے۔ اور ایام طوفان میں بہت دنوں تک اس کشتی میں سوار رہے جب طوفان رفع ہوا تو وہ کشتی کسی پہاڑ منجملہ کوہ ہائے جزائر انڈمان کے ٹھیری تھی۔ یہ لوگ دو سے زیادہ گنتی نہیں جانتے۔ جب کوئی چیز دو سے زیادہ گنتے ہیں تو انگلیوں پر اشارہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ننگے مادر زاد پھرتے رہتے ہیں۔ فقط عورتیں ایک چھوٹا سا پتّا اندام نہانی پر ناگرے میں لٹکا کر رکھ لیتی ہیں۔ مرد عورت اپنے بدن کو بوتل وغیرہ کے ٹکڑوں سے گود کر بھڑوں کا چھتا یا مگسی کا کپڑا سا بنا لیتے ہیں۔ مونچھ داڑھی یا سر کے بال طرح

عورت کوئی نہیں رکھتا۔ ان کو بوتل کے ٹکڑوں سے تراش ڈالتے ہیں۔ ان کا بیاہ
بھی بہت سیدھے سادے طور پر ہوتا ہے۔ بروقت شادی کے دولہا دولہن
دونوں کے بدن کو گیرو اچربی سے لال رنگتے ہیں۔ اور ساری قوم اس وقت
جمع ہوتی ہے۔ ایک آدمی اِس جلسہ میں بطور قاضی کے ہوتا ہے۔ وہی شخص
دولہا کو اٹھاکر دولہن کے پاس لے جاتا ہے۔ اور دولہا کے سامنے بہت سے
تیر وکمان رکھ دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان سے شکار کرکے اپنی عورت کی پرورش
کرنا اور پھر وہی آدمی باآواز بلند لفظ " اَبْ اِکْ " یعنی لے جاؤ یہ تمہاری بیوی
ہے کہتا ہے اِس کہنے کے بعد عقد پکا ہوگیا۔ اور پھر تاحیات دونوں کے نہ
طلاق ہے نہ جدائی شادی کے بعد ان میں زنا نہیں ہے۔ لڑکا پیدا ہونے
کے وقت پردہ کرنے کی ان کے ہاں کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مردوں کے
سامنے عورتیں بچے جنتی ہیں۔ بعد پیدا ہونے بچے کے ایک عورت پتوں سے
مکھیاں ہانکتی ہے اور ایک عورت نال کاٹ کر بچہ کو گود میں لے کر بیٹھتی ہے
پہلے دن بچہ کو غیر عورت کا دودھ پلاتے ہیں۔ دوسرے دن بچہ کی ماں پلانے
لگ جاتی ہے۔ اور بعد وضع حمل کے زچہ اُسی دم چلنے پھرنے لگ جاتی ہے
ہر شئے جنگل کی کھاتی ہے پرہیز یا اچھوانی کا نام نہیں۔ جب بچہ تھوڑا سیانا
ہوتا ہے تو تیر کمٹھ اس کا پہلا کھیل ہے۔ ان لوگوں کا گھر بھی بہت چھوٹا سا
ہوتا ہے۔ صرف چار کھمبے کھڑے کرکے اس کے اوپر تھوڑی سی پتی ڈال کر

ایک چندروزہ آسرا بنا لیتے ہیں۔ ان کے گھر میں اگر جا کر دیکھو تو سوائے میاں بیوی کے اور کچھ جائداد اور ملکیت نہیں۔ تیر و کمان اُن کی اصل جائداد بلکہ جان ہے چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں (کشتی) بھی یہ لوگ بناتے ہیں۔ جن پر سوار ہو کر ایک ٹاپو سے دوسرے ٹاپو کو جاتے ہیں۔ اپنے مردوں کی کھوپریاں یہ لوگ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ جب کوئی مہمان کسی دوسرے ٹاپو سے ان کے یہاں آتا ہے تو پہلے تھوڑے فاصلہ پر اُن کے گھر سے بیٹھتا ہے۔ گھر والے اس کو وہیں کھانا پہنچاتے ہیں۔ بعد کھانا کھانے کے وہ جس گھر میں چاہتا ہے جاتا ہے۔ پھر سب اس سے مل کر روتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتی باڑی نہیں کرتے اور نہ اناج کھاتے ہیں۔ اُن کا کھانا مچھلی اور سمندر کے کیڑے مکوڑے کچھوے وغیرہ ہیں۔ ان کو پکڑ کر اور آگ پر نیم بریاں کر کے بے نمک مرچ کے کھا جاتے ہیں۔ بعض درختوں کی جڑیں اور پھلیاں اور جنگل کے پھل اور پتی اور سور کا گوشت اور شہد بھی انکی خوراک ہے۔ غوطہ زنی کے یہ لوگ بچپن سے عادی ہوتے ہیں۔ کہ شاید کوئی دیگر غوطہ زن قوم دنیا کی ان سے سبقت لے جاوے۔ تیر اندازی بھی یہ لوگ بلا کے ہیں۔ سب سیدھے تیر مارتے ہیں۔ بہت کم ہے کہ ان کے تیر کا نشانہ غلط لگے ان لوگوں میں کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں ہے۔ اور نہ وے کچھ جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں سب بیماریوں کا علاج پھونکا لنا ہے۔ جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو وہ خود یا اُس کا کوئی عزیز نہایت بیدردی اور اناڑی پنے سے بوتل کے ٹکڑوں سے

زخم کرکے خون نکال دیتا ہے۔ اور جب کوئی مرجاتا ہے تو ایک لکڑی میں مردے
کو رکھ کر اس کے گھٹنوں کو موڑ کر اس کی چھاتی تک لاکر باندھ دیتے اور سارے
اعضا کو درخت کے چھلکوں سے کستے ہیں اور پھر قبر کھود کر اس میں گاڑ دیتے
ہیں۔ اور قبر کے نزدیک آگ جلتی رہتی ہے۔ اور ایک یا دو مہینے کے بعد اس کی
قبر کھود کر اس کا ماتم کرکے اس کی ہڈیوں کو اس کے سب عزیز آپس میں تقسیم
کر لیتے ہیں۔ اور پھر ان کو حرز جان کرکے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور کسی لاش کو
بجائے گاڑنے کے ایک مچان پر رکھ دیتے ہیں یا کسی درخت کی شاخ پر لٹکا
دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے سے آدمی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔
دوبارہ زندہ ہونے اور جزا سزا آخرت کے قائل نہیں ہیں۔ وہ لوگ ناچنے
اور گاتے بھی ہیں مگر کوئی باجہ ان کے پاس نہیں ہے اور نہ سُر تال ان کو
معلوم ہے۔ ان لوگوں کا کوئی مذہب اور ملت نہیں ہے اور نہ ان کا کوئی
مذہبی سردار اور ملاں ہے۔ مگر اخلاق اور آدمیت اور دیانت اور راست
بازی ان میں ہے۔ پہلے یہ لوگ روپیہ اشرفی اور پیسوں کی کچھ قدر نہیں
جانتے تھے۔ جو کوئی ان کو دیتا اس کو لے کر اور دیکھ بھال کر زمین پر پھینک
دیتے تھے۔ مگر اب تو بڑے لالچی ہو گئے۔ راہ چلتوں سے پیسہ پیسہ کرکے
سوال کرتے ہیں۔ ان جنگلیوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور ان کی لڑکیاں
بھی بہت جلد بالغ ہو کر اور تیس برس تک بڈھی پھوس ہو جاتی ہیں دودھ

نام ایک ہندوستانی آدمی نے بہت عرصہ ہوا ایک جنگلی عورت سے شادی بھی کی تھی۔ مگر اس کی رہائی ہو جانے کے سبب سے وہ ہندوستان چلا گیا۔ اور بیچاری جنگلن کو وہیں چھوڑ آیا۔

۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک اُن جزائر کی آب و ہوا سم قاتل تھی جس کو زخم ہو گیا وہ تین روز بعد سڑ گیا اور چوتھے دن مر گیا۔ زخم کیا تھا گویا پیام اجل تھا۔ شروع آبادی میں یہاں اسکروی کی بیماری بھی بڑے زور شور سے تھی۔ یہ ایک جہازی بیماری ہے۔ اس سے منہ پک جاتا ہے اور پنڈلیاں سخت پتھر سی ہو جاتی ہیں۔ اور آدمی مر جاتا ہے۔ اس بیماری سے بھی ہزاروں قیدی راہی آخرت ہو گئے۔

انڈمن کی زندگی

الحمد للہ والمنۃ ہمارے وہاں پہنچنے سے ایک برس پہلے وہاں کے سب امراض رفع ہو کر وہ جزیرہ خوبی آب و ہوا میں رشک کشمیر ہو گیا تھا جہاں بیس برس تک ہمارا سر بھی نہ دکھا۔ اللہ بڑے آرام اور راحت سے ہماری قید بسر ہوئی بوجہ کثرت ہیاولی اور نئی آبادی کے انگریزوں نے شروع میں یہاں کے قوانین بھی قیدیوں کے واسطے نہایت نرم کر رکھے تھے اور

قیدیوں سے ہر طرح کا سلوک کرتے تھے مگر جب وہاں کی آب و ہوا عمدہ ہو گئی اور آبادی بھی بڑھ گئی۔ تب وہاں کے ایسے سخت قانون بنائے کہ ااہالیان ہند کے جیلوں پر بھی سختی بڑھادی مگر ہم لوگ ایسے وسط زمانے میں پہنچے تھے کہ آب و ہوا تو عمدہ ہو گئی تھی۔ مگر ابھی قانون میں سختی ترمیم نہ ہوئی تھی۔ اس واسطے از روئے قانون تمام جو اثر تمدکورہ کے ہم کو ہر طرح کا آرام اور آسائش اور عہدہ اور تنخواہ وغیرہ جاتے ہی مل گئے لیکن ہمارے پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں کے قوانین سخت ہونے لگے۔ آخر کو اب یہاں تک نوبت پہنچی کہ نیا قیدی یہاں آکر دس برس تک سخت مشقت کرے اور ٹھنڈا رہے پختہ کھانا پاوے اور وردی کا کپڑا پہنے۔ اور بارک میں رہا کرے۔ اور کسی قسم کی مہربانی اس پر نہ کی جاوے چنانچہ قانون انڈمان مصدرہ ۱۸۷۱ئہ کا ایک فقرہ بطور مثال ذیل میں لکھتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ "سزا حبس بعبور دریائے شور سے سخت مشقت کا کرنا اور فقط اس قدر کھانا پینا کہ جس سے آدمی زندہ رہے ضرور اور لازم ہو جاتا ہے"۔ مگر یہ بھی خبر رہی کہ جس قدر نئے قانون سختی کے آتے رہے وہ فقط آمد جدید قیدیوں پر موثر ہوتے تھے۔ ہم پرانے قیدی ہمیشہ ان سے مستثنیٰ ہو جاتے تھے۔

میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ اس غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے اور نواب اور زمیندار و مولوی و مفتی یعنی ڈپٹی کلکٹر و منصف و

...... صدر امین و صدر الصدور و رسالہ دار و صوبہ دار و جمعدار وغیرہ وہاں
قید ہیں۔ مگر وہ معزز ہندوستانی جنٹلمین بھی جن کے آگے سینکڑوں ہزاروں
نوکر تھے۔ بوجہ سیاہ پوست اور جنم ہند کے دوسرے چوہڑے چماروں کی طرح
موٹا جھوٹا کھانے پاتے اور عام لوگوں کے ساتھ سخت مشقت کرتے تھے
مگر حضرت یورپین گورے بلکہ اکثر دوغلے کالے کلوٹے بھی فقط بوجہ شرف
کوٹ پتلون یا کلمہ عیسائی کے پلٹن کے گوروں کے برابر کھانا کپڑا پاتے تھے
ایک علیحدہ بنگلیاں اُن کے رہنے کو اور ایک نوکر بلا تنخواہ خدمت کو اور
جس گورے یا دوغلے کو لائسنس مل گیا تو ان کو پچاس روپیہ ماہوار تک نقد
تنخواہ بھی ملتی ہے۔ یہ تو سب کچھ تھا مگر ۱۸۷۹ء کا ایک نیا واقعہ عبرت انگیز
دیکھ کر لوگوں کو رونا آتا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ ۱۸۷۰ء میں ایک بدبخت راجہ
جگن ناتھ پوری کا جس کے واسطے مدت تک اخباروں نے بھی سر پھوڑا تھا
قید ہو کر کالے پانی میں پہنچا۔ مگر بوجہ کالا چہرہ ہونے کے بیچارہ عام چوہڑے چماروں
کے ساتھ کھانا پاتا اور مشقت کرتا تھا۔ اور جب بوجہ نازک مزاجی اس سے مشقت
نہ ہوتی تو بیت اور جیل اور چکی پیسنے کی سزا پاتا۔ آخر انہیں صدموں سے تھوڑے
روز بعد وہ راجہ دیپر جیل میں مرگیا۔ اور انہیں ایام میں مسٹر لیمبیر نام ایک
کرانی بھی گو بدن سے کالا مگر یورپین نام اور کوٹ پتلون سے مشرف ملک
اودھ سے قید ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ اس کو گوروں کے ساتھ عمدہ کھانا ملنے لگا۔

ایک علیحدہ مکان پلنگ وغیرہ کل سامانِ عیش و آرام کا مل گیا۔ اور بجائے مشقت کے کچہری ڈپٹی کمشنر میں کلرک ہو گیا۔ چونکہ یہ کمبخت راجہ اور یہ خوش نصیب کرانی دونوں ایک ہی وقت میں وہاں پہنچے تھے یہ اختلاف سلوک اور طرفداری کوٹ پتلون اور ناقدری شرفاء و امراء ہند دیکھ کر ہر کسی کو رونا آتا تھا۔

شادی خانہ آبادی

اتفاق حسنہ اور فضل الٰہی سے ہمارے انڈمان پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد پچاس قیدی بغاوت ۱۸۵۷ء کے جن میں اکثر منشی اور جمعدار وغیرہ بھی تھے۔ حسب المطلب راجہ بروکس جزیرہ سراوک کو کہ ایک ملائی ملک سنگاپور کے مشرق میں واقع ہے بھیجے گئے تھے۔ اس سبب سے عمدہ عمدہ عہدے نشیوں سے خالی تھے۔ میری لیاقت کا حال ان لوگوں کو اس وقت بذریعہ اخبارون کے اور مولوی احمد اللہ صاحب سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس لئے میں تو جہاز سے اُترنے کے ساتھ ہی کچہری صاحب سپرنٹنڈنٹ اور چیف کمشنر میں محرر بکشفوار یا نائب میر منشی مقرر ہو گیا۔ ایک نوکر تنخواہ خدمت کو مل گیا۔ جس آزادان کے جہاں چاہتا رہتا۔ جہاں چاہتا جاتا۔ روک ٹوک مطلق نہ رہی۔ اس وقت

میرا عین عالم شباب قریب ستائیس کے سن وسال تھا۔ جس میں مجرد ی دینی اور دنیوی دونوں قباحتوں سے خالی نہ تھی۔ اس واسطے اول میں نے چاہا کہ ملک سے اپنی بیوی کو بلاؤں۔ مگر اس کو قانون مانع ہوا۔ اس لئے میں نے اپنے پہنچنے کے چند ماہ بعد ایک نو آمدہ کشمیری عورت سے شادی کر لی۔ یہ عورت نہایت کمسن ایک بلائے ناگہانی میں پھنس کر وہاں پہنچی تھی۔ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہنے سے بڑی دیندار اور خدمت گذار ہوئی۔ اب میں دیکھتا تھا کہ رفتہ رفتہ ہر ایک چیز جو ہند میں مجھ سے چھوٹی تھی نعم البدل مجھ کو ملنا شروع ہوا۔ اور جنھوں نے میری دشمنی پر کمر باندھی تھی ایک کے بعد ایک، تباہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ میرے ہند میں واپس آنے کے وقت تک ہر شخص حسب مدارج خود اپنی جزائے واجب کو دنیا ہی میں پہنچ چکا۔ ۲۵ ؍ دسمبر ۱۸۶۷ء کو جس زمانہ میں یہ خاکسار جزیرہ پر سویرنس پنیٹ میں تھا۔ مولوی عبد الرحیم صاحب بھی انڈمان میں پہنچ گئے۔ اور وہاں جا کر اول گھاٹ منشی مقرر ہوئے اور پھر اس کے کچھ عرصہ بعد ہسپتال محرر ہو گئے اور قریب ۹ برس کے اس طرح سے کار سرکار کر کے پھر انھوں نے دوکان بزازہ کھولنے کا ٹکٹ لے لیا۔ اور اسی پیشہ دوکانداری سے اُن کی رہائی ہو گئی۔

سمندر کنارہ کے ملکوں اور جہازی ملازموں اور ریچوں پر اکثر

بحری آفات بھی پڑا کرتی ہیں جن سے ہند کے آدمی سراسر ناواقف ہیں۔ بنگالے پانی میں بھی ہر سال بہت سے آدمی اور کشتیاں سمندر کی نذر ہو جاتی ہیں۔

تین مہلک حادثے

مجھ کو بھی اس مدت بست سالہ میں بارہا ان آفات کا سامنا ہوا مگر عین ڈوبنے کے وقت جب میں چاروں طرف سے نا امید ہو کر اللہ رب العزت کی طرف دل سے رجوع ہوا۔ تو پھر اس رب قدیر نے فوراً بچا دیا۔ منجملہ بہت سے آفات کے جن میں یہ خاکسار مبتلا ہو کر وقتاً فوقتاً بچتا رہا۔ صرف میں تین واقعات کا مختصراً یہاں ذکر کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں جزیرۂ روس سے پرسوپرنس پنیٹ نام ٹاپو کو جاتا تھا۔ پرسوپرنس پنیٹ کے نزدیک پہنچکر ایسا سخت طوفان ہوا کہ کشتی ڈوبنے میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ اس وقت ایک موج نے اس کشتی کو اٹھا کر پل سنگ کے نزدیک کر دیا۔ اس وقت میں اور ایک دو دوسرے مسافر پھرتی کر کے پل پر کود پڑے۔ ادھر ہمارا کودنا تھا کہ ایک دوسری موج نے اس کشتی کو اٹھا کر پل پر دے مارا پس کشتی پرزہ پرزہ ہو گئی۔ اور باقی ماندہ لوگ سخت مجروح ہوئے۔

اسی طرح ایک روز ابرڈین سے روس کو جاتے وقت ایک طوفانی موج نے کشتی کو پل پر ٹیکنا چاہا تھا کہ ہم کود کر پل پر جا کھڑے ہوئے۔ تب کشتی پل سے ٹکرا کر پرزے پرزے ہوگئی۔ اور اکثر مسافر مجروح ہوگئے۔ اور بدشواری ڈوبنے سے بچے۔

ایک تیسری بار ہماری کچہری کا سارا عملہ ایک کشتی میں سوار ہو کر روس سے ابرڈین کو آتا تھا۔ وسط راہ میں ایک ایسا سخت طوفان آیا کہ سب لوگ ناامید ہوگئے اور اپنے کو مُردہ سمجھ چکے تھے۔ بارش بھی بڑے زور سے تھی۔ نہ نزدیک کنارہ تھا نہ کوئی فریادرس تھا۔ اندھیرا ایسا تھا کہ کناروں سے ہماری اس مصیبت کو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت کشتی کا سکان بھی ٹوٹ گیا۔ پانی سے کشتی بھر گئی۔ کوئی چارہ کار و علاج باقی نہ رہا۔ تب میں نے اس فریادرس اور دستگیر درماندگان کو پکارا۔ میرا دعا کرنا تھا کہ غیب سے ہمارے نزدیک یک بیک ایک بڑی کشتی جس میں سردار نگمیل سنگھ صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس سوار ظاہر ہوگئے۔ اور ہم کو اس حال تباہ میں دیکھ کر جھٹ پٹ انھوں نے ہم کو اپنی کشتی میں لے لیا اور صحیح سلامت کنارہ تک پہنچا دیا۔

جنوری ۱۸۶۸ء میں یہ خاکسار جزیرہ ہدو کو بدل آیا۔ اور وہاں اسٹیشن محرر مقرر ہوگیا۔ ۲۰ر فروری ۱۸۶۸ء کو بمقام روس مولوی یحییٰ علی صاحب

راہی فردوس ہوئے اور گو میں اُن سے بہت فاصلہ پر جزیرۂ ہدویں تھا اور مجھ کو ان کی بیماری تک کی بھی اطلاع نہ ہوئی تھی۔ مگر تقدیر مجھ کو عین اس وقت جزیرۂ روس کو لے گئی۔ کہ جب ان کا جنازہ تیار ہو کر نماز پڑھنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہمارے مقدمہ کے کئی آدمی ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہو گئے تھے۔ میری بیوی مولوی یحییٰ علی صاحب سے مرید تھی۔ اور ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کو اس موت کے سبب سے زیادہ صدمہ پہنچا۔ بلکہ ۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو مولوی صاحب کی وفات سے سوا دو ماہ بعد وہ نیک بخت بھی راہی فردوس ہوئی۔ ہند سے قید ہو کر جانا گویا اس بی بی کا اسی خاتمہ بخیر کے واسطے تھا کہ تھوڑے سے دنوں میں اس کو نصیب ہو گیا۔

تجارت

اس بی بی کی وفات کے بعد میں نے سب زیور وغیرہ فروخت کر کے بقدر تین سو روپیہ کے دہلی کو اپنی بیوی کلاں کے پاس بھیجے تھے کہ ان کا مال قسم جوتا وغیرہ سے خرید کر کے میرے پاس بھیج دیوے کیونکہ ان ایام میں پورٹ بلیر میں دہلی کا مال ستگنے دام پر ہوتا ہے۔ مگر یہ مال راہ میں بہت ضائع ہو گیا۔ اور دہلی سے روانہ ہونے کی تاریخ کے دو برس بعد سڑ گل کر

تھوڑا سامال سنہ ۱۸۷۸ء میں میرے پاس پہنچا تھا جس میں سے فقط ایک سو پچاس روپئے مجھ کو وصول ہوئے۔ اور یکصد پچاس روپیہ خسارہ ہوا۔ مگر وہ یکصد پچاس روپیہ بھی جب دوبارہ ایک دوست کے پاس کلکتہ کو واسطے منگانے اور مال کے میں نے روانہ کئے تو بنگالی بابوؤں نے مخبری کرکے وہ ہنڈوی پکڑوا دی تھی۔ کیونکہ میں ملازم سرکار اور مجھ کو پیشہ تجارت کرنا منع تھا۔ میں نے وہ مال ایک سوداگر کے نام سے منگایا تھا اور ہنڈوی ایک افسر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی طرف سے تھی۔ خط بمطلب مال میری طرف سے لکھا ہوا تھا۔ وہ لفافہ معہ خط اور ہنڈوی کے گرفتار ہو کر صاحب چیف کمشنر بہادر کے سامنے پیش ہوا۔ بلحاظ صورت مقدمہ ضبطی ہنڈوی اور میری سزا کا پورا سامان ہو گیا تھا۔ مگر خداوند تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مجھ کو اور ہنڈوی دونوں کو بچا لیا۔ لیکن وہ سوداگر جن کے پاس ہنڈوی بھیجی گئی تھی اس کا روپیہ وصول کرکے کلکتہ سے فرار ہو گیا۔ غرض پیشہ تجارت میرے واسطے منظور نظر الٰہی نہ تھا۔ جس کو اس تاریخ کے بعد پھر کبھی نہیں لیا۔

اس بیوی کی وفات کے بعد میں اور دو برس مجرد رہا۔ مگر ہر دو ٹاپو جہاں اس حالت تجرید میں میرا قیام تھا عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور میں اس ٹاپو میں افسر تھا۔ بہت سی عورتوں نے مجھ کو اپنا شکار کرنا چاہا مگر حفاظت اور صیانت غیبی میرے شامل حال رہی۔ اللہ رب العزت نے

مجھ کو ہلاک نہ ہونے دیا۔ گو میرے عہدہ کے سبب سے رات دن مجھ کو ان فاحشوں
کے ساتھ ملنا پڑتا۔ اور طرح طرح کے ایسے سرکاری کام بھی پڑتے کہ وہ اکثر میرے
گھر میں بھی آتیں اور میرے پھنسانے کی کوشش بھی کرتیں۔ لیکن جس کو خدا بچاوے
اس کو کون مارے۔ میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اپنی بیوی کو پانی پت سے پھر بلانا چاہا
مگر اس وقت وہ راضی نہ ہوئی اور جب ایک دفعہ اس کی کچھ رضامندی بھی ہوئی تھی تو
میری درخواست حاکم وقت نے نامنظور کر دی۔ اس واسطے مجبوراً کسی نیک بخت
عورت سے وہیں نکاح کرنے کی صلاح ٹھیری۔ اور اس بات میں درگاہ الٰہی میں بھی
التجا کی گئی کہ اس مقدمہ میں جیسے تجھے پسند ہو پردہ غیب سے اُسے ظاہر کر دے
اور کسی نیک بخت سے میرا سنجوگ کرائیو۔ اول بعض دوستوں کی صلاح سے یکے بعد
دیگرے دو پنجابی مسلمان عورتوں سے میرے نکاح کی بات چیت شروع ہوئی
مگر باوجود رضامندی طرفین اور نہ ہونے کسی ظاہری مانع کے ان دونوں جگہوں
کی صلاح خود بخود موقوف ہوگئی اور غیب سے وہ بات درہم برہم ہوگئی۔ اس وقت
اس موقوفی کے اسرار بظاہر معلوم نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ دونوں عورتیں بارک
میں بند رہتی تھیں۔ اُن کے چال چلن پر کوئی رائے قایم نہیں ہوسکتی تھی مگر
تھوڑے روز کے بعد جب وہ دوسرے آدمیوں سے شادی کر کے بارک سے
باہر ہوئیں تو پوری فاحشہ اور بدکار نکلیں۔ اُس وقت وہ حکمت الٰہی موقوفی
میری شادی کی معلوم ہوئی۔ اور اس حفاظت غیبی پر میں شکر الٰہی بجا لایا۔ اس

مابین میں کہیں ایک صالح اور جوان عورت کا متلاشی تھا۔

دوسری شادی

ایک ہندو عورت قوم برہمن ضلع الموڑہ کی رہنے والی نئی قید ہوکر وہاں
پہنچی۔ اور بارک عورات ہدو میں ہمارے حوالہ ہوئی۔ میں نے اس کو دیکھا کہ نہایت
خوش چلن اور شرمناک عورت ہے۔ مگر پرلے سرے کی اپنے ہندو دھرم میں
متعصب تھی۔ کسی مسلمان عورت کے نزدیک کھڑا ہونا اور کپڑا چھونے تک
گوارا نہیں کرتی تھی۔ بارک کی مسلمان عورتیں اس کے تعصب سے تنگ آگئیں
میں نے برسبیل تذکرہ ایک روز اس سے کہا کہ اگر تو مسلمان ہو جائے تو تیرے
واسطے دنیا و آخرت میں بھلا ہوگا۔ اور آگ دوزخ سے بھی نجات پائے گی
پہلے تو یہ سوال سن کر اس کو سخت حیرت ہوئی۔ لیکن روز ازل سے اس کا
مسلمان ہوکر میرے بہت سے بچوں کی والدہ ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ اور اسی
سبب سے گو وہ برہمنوں کے گھر ایسے ملک کوہستان میں پیدا ہوئی تھی جہاں
اب تک بھی مسلمانوں کا نام نشان نہیں۔ مگر تو بھی ہمیشہ شرک اور بت پرستی
سے بیزار رہتی تھی۔ اور کبھی بھی بتوں کی پوجا میں شریک نہیں ہوئی۔ گو اس

بیزاری کا سبب خود اس کو بھی معلوم نہ تھا۔ بلکہ اس کی وضع اور عادت کو دیکھ کر
ایک جوتشی برہمن نے اس کی والدہ کو یہ خبر بھی دی تھی کہ یہ لڑکی جلد تم سے جُدا
ہو جاوے گی۔ ادھر اپریل ۱۸۶۵ء میں میری کشمیرن بیوی فوت ہوئی ادھر
الموڑہ کے پہاڑ پر میری اِس برہمنی بیوی پر ایک ناگہانی مقدمہ کھڑا ہو کر گرفتار
ہو گئی۔ چنانچہ مختصر صورت اِس مقدمہ کی یہ ہے کہ ایک لڑکی جو اس میری بیوی
کے ساتھ باہر ایک ڈھٹے کنوئیں پر کھیل رہی تھی۔ پاؤں پھسل کر کنوئیں
میں گِر کر سخت مجروح ہو گئی۔ گو اِس ناگہانی آفت میں میری بیوی کا کچھ
قصور نہ تھا۔ مگر دونوں لڑکیوں کے والدین میں سخت عداوت تھی۔ بوجہ
ایک عداوت کے ایک مقدمہ اِقدامِ قتل اِس بے گناہ پر کھڑا کر دیا گیا۔
وہ زخم بھی چند روز کے بعد اچھا ہو گیا تھا۔ اِس سبب سے قانوناً یہ مقدمہ
اِس لائق نہ تھا کہ اس میں دائم الحبسی کی سزا دی جاوے۔ مگر اس حکیم
اور قدیر کو اس وقت اِس بیوی کا پورٹ بلیر پہنچانا اور میری بیوی کرانا
منظور تھا تو اِس جرم میں یہ گرفتار ہو گئی۔ پہلی ہی شب گرفتاری کو بوقت
سحر اس نے ایک بزرگ نورانی چہرہ بوڑھے مسلمان کو خواب میں دیکھا
جس نے اس کو ایک ٹھوکر مار کر اس سے کہا کہ اُٹھ نماز پڑھ اور دعا کر تیرے
واسطے قید ہونا اچھا ہوا۔ اس نے اس سے پہلے ایسی شکل اور ہیئت
کبھی نہ دیکھی تھی اور نہ لفظ نماز اور دعا کا کبھی سنا تھا، گھبرا کر جاگ اُٹھی

اور محافظین میں جو ایک مسلمان سپاہی تھا اُس سے یہ خواب بیان کرکے اس کی تعبیر پوچھی جس نے کہا کہ تو ضرور تقید ہو کر مسلمان ہو جاوے گی۔ یہ تعبیر گو اس وقت اس کے دل پر نہایت شاق اور غیر ممکن معلوم ہوئی تھی۔ مگر بوجہ اسی قبولیت ازلی اور تعبیر رویا حقہ کی اب اُس نے آخر میرے کہنے کو قبول کرلیا۔ اور مسلمان ہونے اور مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہوگئی۔ اِتفاق حسنہ سے انہیں ایام میں رمضان شریف آگیا۔ میں نے ستائیسویں شب رمضان کو ایک بڑا دھوم دھام کا کھانا کرکے اس کو مسلمان بنایا۔ اور جب ارکانِ اسلام اور نماز وغیرہ خوب سیکھ گئی۔ تو حاکمِ وقت سے اِطلاع کرکے ۱۵ ہر اپریل ۱۸۷۰ء کو اس سے نکاح کرلیا۔ صدہا آدمی میرے نکاح میں شریک ہوئے تھے۔ اور ہمارے مولانا مولوی احمد اللہ صاحب نے یہ نکاح پڑھا تھا۔ دوسرے دن بڑی دھوم دھام سے اس کا ولیمہ ہوا۔ اس بیوی سے مجھ کو دس بچے پیدا ہوئے جن میں سے آٹھ بچے اِس وقت تک زندہ موجود ہیں۔ اور یہی بیوی پورٹ بلیر سے ہند کو میرے ساتھ آئی۔ اور یہ بائیس برس گذشتہ اُس نے نہایت رفاقت اور اِطاعت اور عصمت سے بسر کر دیئے۔ اور توحید اور توکل میں بھی یہ بی بی لاثانی ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

میں نے پورٹ بلیر میں پہنچ کر چند خطوط اشعار اپنے آرام سے رہنے اور شادی کرنے اور بطور آزاد نوکری سرکار کرنے کے حاجی محمد شفیع صاحب انبالوی کو وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ اور اُن لوگوں کو جو دوسرے بے قصور مسلمانوں کو پھنسا کر بطور نیم رہا شدہ کے ذلت کی جوتیاں کھاتے پھرتے تھے حسرت دلانے کے واسطے اپنی راحت اور تائید الہٰی کو خوب الفاظی مبالغہ میں بیان کیا تھا۔ لیکن کبھی کسی خط کا جواب میرے پاس نہیں آیا۔ مگر اس مابین میں مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ کسی نے وہ خطوط بنظر اظہار خیرخواہی سرکار میں پیش کر دیئے۔ اور گورنمنٹ ہند تک پہنچ کر اُن پر بہت بحث ہوئی اور سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر سے کیفیت بھی طلب کی گئی۔ اور قریب تھا کہ اگر فضل الہٰی میرے شامل حال نہ ہوتا۔ اور حکام پورٹ بلیر میرے واسطے بطور وکیل نہ جھگڑتے اور اُن مہربانیوں اور رعایتوں کا مجھ سے چھین لینا خلاف قاعدہ عام پورٹ بلیر کے نہ ہوتا۔ تو میرے واسطے سخت مشقت کرنے کا حکم ہو جاتا۔ اور یہ بھی ایک شان الہٰی اور تائید غیبی تھی کہ جان لارنس صاحب بہادر گورنر جنرل مجھ سے غریب قیدی سے جس کے وارنٹ میں تاحیات سخت مشقت کرنے کا حکم ہو سخت مشقت

کرانا چاہتے اور وہ رب العزت ایسے جھگڑوں پر بھی مجھ کو مشقت سے بچالیوے۔

ایک یہ امر بھی تائید الٰہی سے تھا کہ جب ہم پورٹ بلیر پہنچے اس وقت وہاں کے سب حاکم مدراس احاطہ کے تھے۔ بغاوت ۱۸۵۷ء اور معرکہ وہابیوں سے کچھ بھی واقف نہ تھے۔ اس سبب سے اُن کے سینے صاف اور خالی از تعصب تھے۔ اُنھوں نے ہمارے ساتھ کچھ تعصب نہیں کیا۔ بلکہ بوجہ خوش چلنی اور عمدہ کارگزاری کے ۱۸۸۰ء تک سب قیدیوں سے زیادہ مہربانیاں اور رعایتیں ہمارے ساتھ ہوتی رہیں۔ لیکن جب اول بار ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے نمک مرچ لگا کر ہمارے مقدمہ کو رائی سے پہاڑ اور رسّی سے سانپ بنایا اور لکھ دیا کہ وہابی اور باغی دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور پھر بنگال کورے صاحب لوگ اِس جزیرہ میں آنے لگے۔ اُس وقت تو ہم لوگ ایک نشانہ ہو گئے راہ گلی چلتے میں ہماری طرف اِشارے ہوا کرتے تھے۔ اور بہت سے صاحب لوگ ہمیشہ اِسی گھات میں رہتے کہ کوئی موقع اور قانونی حیلہ پا کر ہم کو تکلیف دیں۔ لیکن جب ایسا محافظ حقیقی کسی کی محافظت کرے تو اُس کو کون تکلیف دے سکتا ہے؟ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ جب ایک صاحب در پئے تکلیف دینے ہمارے کے ہُوا تو اس کے مقابل دوسرا صاحب اس سے بھی بڑا ہماری مدد اور اعانت کو کھڑا ہو گیا۔

سکرنیل مین صاحب کے عہد میں ایک بڑے یورپین افسر کی تحریک سے

میرے اُوپر ایک جھوٹا مقدمہ اعانت تصرف بیجا کا کیا گیا۔ اور کرنیل مین صاحب سابق تعصب حاکم مجھ سے ایسا برافروختہ ہوگیا کہ مجھ کو فوراً بذریعہ سمن عدالت میں طلب کر لیا۔ اُس وقت میرے بہت دوستوں نے مجھ کو یہ صلاح دی تھی کہ جان بچانے کے واسطے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ تم اس مقدمہ میں اپنی لاعلمی بیان کر کے اپنی جان بچالو۔ مگر میں نے کہا کہ جو کچھ ہو سو ہو میں تو سچ بولوں گا۔ آخر جب مقدمہ پیش ہوا۔ سب سے اول میں بلایا گیا۔ اور کرنیل صاحب موصوف میرے اظہار لکھنے لگے۔ میں نے صحیح طور پر حرف بحرف بیان کر دیا۔ کہ ہاں میرے سامنے مسٹر ہیوڈ اوور سیر مدعاعلیہ نے مسمی حمید خاں جمعدار مدعی کی جائداد جہاں جہاں پائی بطور خود ضبط کر کے آپ نیلام اور فروخت کر دی اور اس کا زرثمن آپ کھا گیا۔ میں بوجہ ہونے محرر اسٹیشن کے ضرور اس کے ہمراہ تھا۔ میرا اس قدر بیان ہونے پر مسٹر ہیوڈ سے سب روپیہ حمید خاں مدعی کو دلا یا گیا۔ اور ہیوڈ مذکور جو سو روپیہ ماہوار کا اوور سیر تھا نوکری سے موقوف ہو کر ان جزائر سے بدر کیا گیا۔ اور میں اپنے سچ کی برکت سے صاف بری ہو کر اپنے گھر کو چلا آیا۔

جنوری ۱۸۶۹ء میں لفٹنٹ پراتھرو صاحب جو اس وقت کرنیل اور قائم مقام چیف کمشنر پورٹ بلیر کے ہیں کالے پانی میں اسسٹنٹ ہو کر آئے اپریل ۱۸۶۹ء میں ہماری بقرعید پڑی۔ ایک بیل مول لے کر اپنے دستور کے موافق ہم نے قربانی کرنا چاہا تھا۔ مگر قربانی کرنے کے وقت ہندوؤں نے

بلوہ کرکے وہ بیل ہم سے چھین لینا چاہا۔ ہمارے ساتھ بھی چند آدمی تھے۔ ہم نے ان کا غیر واجبی حملہ سمجھ کر بیل نہیں دیا۔ ہندو حسب عادت خود بڑے جوش خروش پر تھے۔ ہم نے عین اسی وقت میں کہ جماعت ہنود بیل کی قربانی کے ساتھ ہماری قربانی کرنے کو ہمارے سر پر مسلح کھڑے تھے بیل کو قربانی کر دیا۔ ہم مسلمان فقط چار یا پانچ آدمی تھے۔ اور ہندو دو سو نفر سے بھی زیادہ تھے۔ پس ایسی قلیل جماعت کو بمقابلہ ایسی کثیر اور پُر جوش جماعت ہنود کے باز رہنا ہی قرین مصلحت تھا۔ مگر مذہبی جوش اور ادائے فرض نے ہم کو بھی اس فعل کے کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب ہندوؤں کی آنکھ کے سامنے قربانی کا خون بہا تو اس پر بڑا بلوہ اور شور و شر ہوا۔ قریب تھا کہ دس بیس خون ہو جاویں۔ مگر پولیس اور اوورسیر کے جلد پہنچ جانے پر نوبت کشت و خون کی نہ پہنچی۔

ہندوؤں کی ناکام چوٹیں

لیکن مقدمہ کچہری میں چلنے لگا۔ گو ہندو بڑے مالدار صاحب اقتدار اور حکام کے منہ چڑھے تھے۔ مگر پراتھرو صاحب کی کوشش اور امداد سے ہم لوگ بچ گئے۔ جیسے میرے خیالات اور سمجھ اس وقت ہے۔ اگر اس وقت بھی ایسے

ہی ہوتے۔ تو میں بجائے اِس بیل کے بکرا قربانی کرتا۔ اور صدہا آدمیوں کے دلوں کو نہ دُکھاتا ؎

دل میازار ہر چہ خواہی کن؛
کہ در شریعت ما غیر ازین گناہے نیست

اِس وقوع قربانی کے بعد حسب عادت خود سب پورٹ بلیر کے ہندو متفق ہو گئے۔ اور یہ صلاح ہوئی کہ چاہے ہزاروں روپیہ خرچ ہو جاوے۔ مگر محمد جعفر کو سخت سزا کرائی جاوے۔ اِس لیے مونگالال ایک میرے ماتحت محرر کو اِس بات پر آمادہ کیا کہ جس طرح ہو سکے حساب نقدی اِسٹیشن میں تبدیل تغیر کرا کے کوئی مقدمہ غبن اور چوری روپیہ سرکاری کا محمد جعفر پر دائر کرایا جاوے۔ اِسی واسطے بے اطلاع میرے یہ سازش ایک ہندو ریڈر کے ایک حساب نیلام میں جو میری معرفت سے ہوا تھا قریب ؁۳۰۰ روپیہ کے غبن میرے اُوپر قائم کر دیا۔ اور فارسی اور انگریزی دونوں حسابوں سے وہ رقومات تصدیق کرا کے بہت سے گواہ بھی تیار کر لئے۔ گو صاحب ضلع تک کو در پردہ اِس کی رپورٹ ہو گئی تھی مگر مجھ کو ابھی تک اِس کارروائی کا کچھ علم نہ تھا۔ آخر ایک روز یک بیک اور سیر نے میرے گھر پر آ کر میری کل کتابیں حساب سرکاری کی قید کریں۔ اس وقت مجھ کو معلوم ہوا کہ میرے قتل کا سب سامان تیار ہے۔ دوسرے دن اُس کی دریافت و تحقیقات ہونے والی تھی۔ خیر میں نے اِس کارروائی سے مطلع ہو کر اپنے رَب سے دُعا کی۔ اور

اور سپرسے جس کے زیرحراست میری کتابیں تھیں سازش کرکے مخفی طور پر ایک گھنٹے کے واسطے اپنی کتابیں واپس لے لیں۔ اور اسی ایک گھنٹے کے اندر وہ کل کارروائی جعلسازی کی جو مہینوں میں طیار ہوئی تھی۔ رفع دفع کرکے میں نے اپنا حساب ٹھیک ٹھیک تیار کرکے کتابیں پھر اوورسیر کے حوالے کردیں۔ دوسرے دن باجلاس پراتھرو صاحب بہادر تحقیقات شروع ہوئی۔ جب حسب نشاندہی مدعیان کتابوں میں میرا حساب دیکھا گیا۔ تو سب ٹھیک تھا۔ سرمو تفاوت نہ نکلا اور چونکہ پراتھرو صاحب نے مقدمہ قربانی سے چند روز پہلے ہم کو بری کیا تھا۔ اُس نے فوراً کہہ دیا کہ یہ مقدمہ محض دروغ اُسی مقدمہ قربانی بیل کی عداوت سے ہے۔ مونگالال میرے ماتحت محرر کو چھ ماہ قید سخت کی سزا دے کر اس ہندو رپٹر کو ایک درجن بیت کی سزا دی اور مجھ کو بری کردیا۔ ہندو تو مجھ پر ایسے غصہ ہو رہے تھے کہ انہوں نے کورٹ میں کھڑے کھڑے ایک دوسرا الزام چوری مجھ پر قائم کردیا۔ تفصیل اُس کی یہ ہے کہ مونگالال مذکور نے بعد پالے سزا کے ہاتھ باندھ کر پراتھرو صاحب سے عرض کیا کہ کچھ میری عرض ہے۔ صاحب نے کہا کہ کیا ہے کہو۔ تب وہ بولا کہ حضور نے جو تختہ ہائے چوب سرخ محمد جعفر کو واسطے بنوانے بازار کے دیئے تھے اس نے ان تختوں سے اپنے گھر کے دروازے اور تخت پوش و صندوق بنوالیے۔ اور بازار میں نہیں لگائے۔ اگر حضور اسی وقت تکلیف کریں تو میں وہ سب چیزیں محمد جعفر کے

گھر سے پکڑوا دوں۔ جب یہ بیان ہو رہا تھا۔ میں سر نیچے کئے ہوئے خداوند تعالےٰ سے دعا کرتا تھا کہ اس آفت سے بچانا بھی تیرا ہی کام ہے۔ کیونکہ جن جن چیزوں کا اُس نے نام لیا تھا وہ سب میرے گھر میں موجود تھیں۔ اور اس وقت اگر حاکم مجھ سے سوال کرتا۔ تو میرے خیال میں میرے نزدیک سوائے ہاں کے کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن اس مقلب القلوب کی قدرت کو دیکھئے۔ بعد غور سے سننے اس عرض اور دعویٰ کے پادری صاحب نے مونگالال سے کہا کہ "وہ تختہ ہم نے اس کو دیا ہے۔ تم کو اس میں مخبری کرنے کا کیا اختیار ہے"؟ اُسی دم اُس کو عدالت سے باہر نکلوا دیا۔ اور مجھ سے فرمایا کہ تم گھر کو جاؤ اور ہوشیار رہو۔

۱۸۶۹ء میں ایک رات کو جب کہ میرے گھر میں قریب پانچ سو روپے کے سرکاری روپیہ تنخواہ قیدیاں اسٹیشن ہردوئی کا رکھا ہوا تھا میرے گھر کی کھڑکی توڑ کر ایک چور میرے مکان کے اندر گھس آیا۔ اور بتی کو جو میرے پلنگ کے نزدیک جلتی تھی بجھا دیا۔ ایک چھوٹا سا صندوقچہ روپیہ سے بھرا ہوا میری پائینتی کے پاس رکھا تھا۔ میں غافل سوتا تھا۔ میرا ایک نوکر مراد نام دوسری کوٹھری میں تھا۔ اُس وقت چور کو وہ صندوق اٹھا لیجانے کو کوئی چیز مانع نہ تھی۔ لیکن قدرت الٰہی سے یک بیک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اندھیرا دیکھ کر اور کچھ آہٹ پا کر اپنے نوکر مراد کو بلایا۔ تو چور خالی ہاتھ نامراد ہو کر اسی دم بھاگ گیا۔

اور اس رب العزت نے میری عزت رکھ لی ۔ بشرطیکہ چوری ہو جانے اُس سرکاری روپیہ کے بظاہر میری سخت خرابی اور بربادی تھی ۔

مارچ ۱۸۷۰ء میں میں نے یکصد پچاس روپیہ کی ایک ہنڈوی از طرف مسٹر روپ اسٹراپ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنام منشی غلام نبی صاحب خزانہ کلکتہ پر واسطے منگانے بعض ضروری سامان اپنی شادی کے بھیجنا چاہا تھا اور وہ مال بھی ایک دوسرے سوداگر کے نام سے منگانا تجویز کیا تھا ۔ کیونکہ میں ملازم سرکار تھا مجھ کو نہ ہنڈوی بھیجنے کا اختیار تھا اور نہ مال منگانے کا ۔ یہ سب کارروائی ناجائز مخفی طور کی گئی تھی ۔ جب میں نے خط معہ ہنڈوی ڈاک میں ڈالا تو ہندو میرے دشمنوں کو بھی اس حال کی کسی ذریعہ سے خبر ہو گئی ۔ انھوں نے کرنیل مین صاحب چیف کمشنر سے مخبری کر کے فوراً اس خط اور ہنڈوی کو پکڑوا دیا ۔ اور تجویز ہوئی کہ سوائے ضبطی اس روز ہنڈوی کے مجھ کو سزا بھی ہو گی جب مجھ کو اس گرفتاری خط اور ہنڈوی کی اطلاع ہوئی تو جناب الٰہی میں التجا کر کے پراتھرو صاحب سے جا کر سارا حال بیان کیا ۔ اور وہی مقدمہ قربانی اس عداوت کا سبب ظاہر کیا ۔ پراتھرو صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم کچھ فکر نہ کرو ۔ میں کرنیل مین صاحب سے ملاقات کر کے اس کا حال دریافت کروں گا ۔ غرض پراتھرو صاحب کرنیل صاحب موصوف کے بنگلے پر گئے ۔ اور اُن سے ملاقات کر کے میری ہنڈوی اور خط دونوں واپس لے آئے ۔ اور مجھ کو لا کر دے دیئے ۔ اور فرمایا کہ ہندو تمہارے

دشمن ہیں تم ہوشیاری سے کام کرو۔

مولوی محمد حسن صاحب کی تشریف آوری

اگست ۱۸۷۰ء میں یہ عاجز پھر کچہری صاحب چیف کمشنر بہادر میں جزیرۂ ہدو سے صدر مقام جزیرۂ روس کو تبدیل ہوگیا۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں جب میں جزیرۂ روس میں تھا مولوی محمد حسن صاحب ہم لوگوں کی ملاقات کو پٹنہ سے پورٹ بلیر کو آئے۔ اور ایک مہینے تک رہ کر پھر اپنے ملک کو واپس تشریف لے گئے۔ ایک دن جب مولوی محمد حسن صاحب بڑے ذوق وشوق سے کشتی میں سوار ہو کر جزیرۂ روس سے جزیرۂ وائپر کو مولوی احمد اللہ صاحب کی ملاقات کیلئے جا رہے تھے۔ راستے میں وہ کشتی سخت طوفان میں پڑی۔ اور قریب تھی کہ ڈوب جاوے۔ اس وقت اپنے ڈوبنے سے زیادہ مولوی محمد حسن صاحب کو یہ افسوس تھا کہ مولوی احمد اللہ صاحب کی زیارت بھی نصیب نہ ہوئی۔ لیکن یہ فقط آزمائش الٰہی تھی۔ چند جھونکوں کے بعد طوفان رفع ہوگیا۔ اور مولوی صاحب موصوف بخیریت تمام وائپر پہنچ گئے اور مولوی احمد اللہ صاحب سے ملاقی ہوئے۔ ہماری گرفتاری کے بعد انگریزوں نے مولوی محمد حسن کو بھی پھنسا کر کالے پانی بھیجنا چاہا تھا۔ مگر حکمت

ربی سے وہ محفوظ رہے۔ لیکن اللہ رب العزت نے اس طرح پر بھی کالے پانی تک پہنچا کر اور بعض مصائب بحری میں ڈال کر کالے پانی والوں کے اجر میں شریک کر دیا۔

مارچ ۱۸۷۱ء میں کرنیل مین صاحب چیف کمشنر پنشن پا کر ولایت کو گئے۔ اور اکتوبر ۱۸۷۱ء میں جنرل اسٹوارٹ صاحب جو اخیر میں جنگی لاٹ ہند کے بن گئے تھے۔ چیف کمشنر ہو کر انڈمان کو تشریف لائے۔ اسی صاحب کے عہد میں حسب ایماء لارڈ میو صاحب بہادر کے پورٹ بلیر میں بھنڈارہ کا کھانا قیدیوں کے واسطے مقرر ہوا۔ اور لارڈ میو صاحب کا بنایا ہوا وہ قانون بھی جاری ہوا جس سے پورٹ بلیر کی قید ہندوستان اور ولایت کے جیل خانوں سے بھی زیادہ سخت ہو گئی۔

لارڈ میو گورنر جنرل کا قتل

---

۸ ؍ فروری ۱۸۷۲ء کو لارڈ میو صاحب کا قتل بھی اس سپرنٹنڈنٹ کے عہد میں ہوا۔ جس کو بطور مختصر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

لارڈ میو صاحب بہادر ۸ ؍ فروری ۱۸۷۲ء کو سات بجے کے بعد

معہ چار اگنبوٹوں کے جزیرۂ انڈمان میں رونق افروز ہوئے۔ صدہا صاحب لوگ اور میم واسطے سیر جزائر ہذا کے لارڈ صاحب کے ساتھ تھے۔ آٹھ بجے کے بعد گورنر صاحب معہ چند ہمراہیان خود جہاز سے اتر کر جزیرۂ روس میں جو صدر مقام پورٹ بلیر کا ہے شرف افروز ہوئے۔ اُترنے کے وقت لارڈ صاحب کے واسطے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی ہوئی۔ اُس وقت ہزاروں مرد عورت آزاد اور قیدی اِس نظارے کے واسطے گھاٹ جزیرۂ روس پر حاضر تھے۔ لارڈ صاحب بہادر ٹاپو میں اُترنے کے ساتھ ہی بازار روس ایلنڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اِسکول و بازار و ہسپتال و بارک ہائے قیدیاں و بارک ہائے جنگی پلٹن کا ملاحظہ کرکے چیف کمشنر صاحب انڈمان کے بنگلہ پر تشریف لے گئے اور وہاں لُغن تناول فرماکر اور تھوڑا آرام کرکے گورہ بارک کا ملاحظہ کیا۔ اور پھر اگنبوٹ کو دیکھتے ہوئے وپیر لینڈ کو جہاں بدمعاش قیدی جیل میں رہتے ہیں شرف افزا ہوئے اور بعد ملاحظہ وپیر کے جزیرہ چاٹم کو واپس آئے۔ جزیرۂ چاٹم مابین راہ جزیرۂ روس اور جزیرۂ وپیر کے مونٹ ہریٹ کے پہاڑ کے قریب واقعہ ہے۔ چاٹم میں ایک دخانہ آرہ گھر ہے یہاں ایک لکڑی کے تختہ کو لارڈ صاحب نے بہت پسند کیا۔ چاٹم میں پھرتے پھرتے یک بیک لارڈ صاحب کے دل میں آیا کہ اسی وقت مونٹ ہریٹ کے پہاڑ کو بھی ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ پرائیویٹ سکرٹری

اور چیف کمشنر صاحب نے بوجہ غیر وقت ہو جانے کے اُس دن مونٹ ہریٹ کو جانے سے بہت اصرار سے اُن کو منع کیا۔ لیکن لارڈ صاحب نے نہ مانا یوں کہو کہ موت نے اُن کو نہ ماننے دیا۔ اور جاتم سے سوار ہو کر ہوپ ٹون میں جو زیر پائے کوہ مونٹ ہریٹ کے آباد ہے۔ پہنچے اِس ٹاپو میں شیر علی نام ایک آفریدی قیدی مدت دراز سے ایک چھری : اسکے قتل کرنے کے کسی افسر اعلیٰ کے تیار کر کے منتظر بیٹھا تھا۔ جب لارڈ صاحب کی کشتی ہوپ ٹون میں پہنچی تو شیر علی مذکور اپنی چھری ہمراہ لے کر آن پہنچا۔ ہوپ ٹون سے لارڈ صاحب کے ہمراہ تھا مگر راستہ میں کہیں اُس کا داؤ نہ چلا۔ اور لارڈ صاحب بخیریت تمام پہاڑ پر پہنچ گئے۔ اب وقت غروب آفتاب کا آگیا تھا۔ لارڈ صاحب نے وہاں بیٹھ کر سمندر میں غروب آفتاب کا تماشہ دیکھا اور فرمایا کہ ایسا خوبصورت نظارہ میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہیں دیکھا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو مشعلوں کی روشنی میں نیچے اُترنے لگے۔ اس وقت ایک مسلح جماعت پولیس لارڈ صاحب کے چاروں طرف تھی۔ اور چیف کمشنر صاحب اور پرائیویٹ سکریٹری لارڈ صاحب کے دائیں بائیں بدن سے بدن ملائے ہوئے چلتے تھے اور دوسرے بیسیوں افسران کے پیچھے پیچھے تھے۔ اترائی میں بھی لارڈ صاحب بخیریت تمام ہوپ ٹون کے گھاٹ تک پہنچ گئے۔ مگر جب گھاٹ پر ایک گاڑی کے نزدیک جو وہاں اُس دن کھڑی تھی پہنچے۔ چیف کمشنر صاحب

لارڈ صاحب کی اجازت لے کر کسی ضرورت کے واسطے پیچھے کو ہٹ گئے اور لارڈ صاحب معہ پرائیوٹ سکریٹری آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے۔ اس وقت گاڑی کی آڑ میں سے ایک آدمی نے مثل شیر کی کود کر لارڈ صاحب کو دو زخم کاری ایک چھری سے ایسے لگائے کہ لڑکھڑا کر لارڈ صاحب سمندر میں جا پڑے۔ اس گڑبڑ میں شعلیں بھی سب گل ہو گئیں۔ مگر ایک دوسرے قیدی نے جراءت کر کے ایک قاتل کو پکڑ لیا ورنہ وہ اور دو چار کو مارتا۔ لارڈ صاحب کو سمندر سے نکالا۔ اور اسی گاڑی پر لٹایا۔ وہ تو ایک دو باتیں کر کے راہی ملک بقا ہوئے۔ جب قاتل سے پوچھا کہ تم نے یہ کس واسطے کیا؟ اس نے کہا کہ میں نے خدا کے حکم سے کیا ہے۔ پھر پوچھا کہ تمہارا کوئی شریک ہے؟ تو جواب دیا کہ خدا میرا شریک ہے بعد تحقیقات ضابطہ منظوری ہائی کورٹ بنگال کے قاتل کو پھانسی کا حکم ہوا۔ یہ قاتل شیر علی نام ضلع پشاور کا ایک پہاڑی افغان تھا۔ اس نے کہا کہ ۱۸۶۹ء سے میرا ارادہ تھا کہ کسی بڑے افسر انگریز کو ماروں گا۔ اس واسطے چند سال سے میں نے یہ چھرا تیار کر کے رکھا تھا جب ۸ ماہ فروری ۱۸۷۲ء کو لارڈ صاحب آئے اور ان کی سلامی ہوئی تو میں نے دوبارہ اس چھری کو تیز کیا۔ میں تمام دن اس تاک میں رہا کہ میں کسی طرح اس ٹاپو میں پہنچوں جہاں لارڈ صاحب پھرتے ہوئے مجھ کو ملیں۔ مگر مجھ کو وہاں جانے کی رخصت نہ ملی۔ تقدیر شام کے وقت جب میں مایوس ہو گیا تھا لارڈ صاحب کو میرے گھر لے آئی۔ میں

پہاڑ پر بھی لارڈ صاحب کے ساتھ گیا تھا۔ اور ساتھ ہی واپس آیا۔ مگر جانے اور آنے میں پہاڑ کے اوپر کہیں مجھ کو ایسا موقع نہیں ملا۔ تب میں اِس گاڑی کی آڑ میں آکر چھپ رہا۔ یہاں سے میری مرادِ دلی پوری ہو گئی۔

یہ شخص گو ضعیف البحثہ اور پست قد آدمی تھا۔ مگر بڑا شہ زور اور دلیر آدمی تھا پھانسی پڑنے کے وقت تک وہ کچھ ہراساں نہیں ہوا۔ پھانسی کے اوپر چڑھ کر اس نے بآوازِ بلند قیدیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ بھائیو! میں نے تمہارا دشمن کو مار ڈالا ہے۔ اور تم گواہ ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اور پھر کلمہ پڑھنے لگا۔ اور کلمہ پڑھتے پڑھتے ہی اُس کی جان جسم سے پرواز کر گئی۔

یہ وقوعہ قتل لارڈ صاحب کا ایک ایسے ادنیٰ قیدی کے ہاتھ سے ہونا ایک نمونہ قدرتِ الٰہی کا تھا۔ ورنہ کہاں گنگو تیلی اور کہاں راجہ بھوج۔ جب موت آئی تو صدہا محافظ کرچوں والے اور وہ اَن گِنت مسلح پولیس والے اور وہ بند وبست اور خبرداریاں کچھ کام نہ آئیں۔ وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ کسی کو اُس کی قدرت میں دخل نہیں۔

اِس سے ایک مہینہ پہلے ایک دوسرے پشاوری افغان نے چیف جسٹس نارمن صاحب کو اسی طرح کلکتہ میں چھرے سے مار ڈالا تھا۔ اب چاہیئے تھا کہ بعد ایسے واقعات وحشت اور عبرت انگیز کے انگریز لوگ پٹھانوں کے دشمن ہو جاتے۔ مگر میں نے دیکھا کہ پہلے سے دو چند پٹھانوں کی خاطر داری

صاحب لوگ کرنے لگے۔ اور بجائے افغانوں کے بدنصیب وہابیوں کے اور زیادہ دشمن ہوگئے تو میں نے سمجھا کہ مارنے والے سے ہر کوئی ڈرتا ہے اور غریب پر ہر کوئی شیر ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب ہم کو اُس وقت ہوا کہ جب بعد اس وقوعہ قتل لارڈ صاحب کے پلٹ صاحب کمشنر پولیس کلکتہ اور لالہ ایشری پرشاد ہمارے پرانے دوست جو پہلے ہم غریبوں پر گپ شپ لگا کر سارجن سے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے اور چند دوسرے نامی افسر پولیس ہند سے یہ بیڑہ اُٹھا کر پورٹ بلیر میں پہنچے کہ ہم اس مقدمہ میں وہابیوں کو ضرور پھنسا دیویں گے۔ مگر فضل الٰہی سے اُس وقت پورٹ بلیر میں جنرل اسٹوارٹ صاحب اور پراتھر صاحب وغیرہ ایسے ہوشیار اور بیدار مغز افسر ہمارے حالات اور چلن اور اس قتل کی کیفیت اور قاتل کے حالات سے بخوبی واقف موجود تھے۔ اس سبب سے اس مرتبہ ایشری پرشاد کا شکار خالی گیا۔ ورنہ اُس نے پورٹ بلیر میں پہنچتے ہی مثل سابق جھوٹے گواہ بنانے شروع کر دیئے تھے۔ مگر جنرل اسٹوارٹ صاحب نے کہا کہ ہم ان وہابیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اور ایسی ناجائز کارروائی جھوٹی شہادت تیار کرنے کی ہم اپنے علاقہ میں نہ ہونے دیویں گے۔ اس سبب سے اُس رب العزت نے اس ناگہانی آفت سے بھی ہم کو محفوظ رکھا اور جو اصل مجرم تھا سزا پا گیا۔

میں نے انگریزی سیکھ لی

پورٹ بلیر میں رہ کر بھی تا وقوعہ قتل لارڈ میو صاحب میں انگریزی سے واقف نہ تھا۔ ۱۸۷۲ء میں رام سروپ نام ایک انگریزی خواں کی ترغیب سے ایک برس کی محنت میں مجھ کو انگریزی بولنے اور پڑھنے لکھنے میں خوب مہارت ہو گئی۔ چونکہ میں صاحب لوگوں کو اپنی فرصت کے اوقات میں فارسی اردو، ناگری وغیرہ زبانیں سکھلایا کرتا تھا۔ ان کے ساتھ رات دن بات چیت رہنے اور ان کے سبقوں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے سمجھانے اور ان کے تحریری ترجموں کو صحیح کرنے کے سبب سے روز بروز میری استعداد انگریزی میں بڑھتی گئی۔ اور وہاں اس وقت تک بوجہ قلت کاتبوں کے ملازمان سرکاری کو عرائض و اپیل نویسی کی بھی ممانعت نہ تھی پھر میں نے عرضی و اپیل بھی انگریزی زبان میں لکھنے شروع کر دیئے تھے جس میں سوائے ترقی استعدادِ علمی کے ہزاروں روپیہ کا فائدہ بھی مجھ کو ہوا۔ یہی دو پیشے یعنی معلمی صاحبان اور عرائض نویسی تھے جس میں مجھ کو سو روپیہ ماہوار سے کم نہ ملتا تھا۔ چونکہ میرے سوا وہاں کوئی مسلمان

انگریزی خوان نہ تھا۔ میں نے بڑے بڑے اہم مقدمات اہلِ اسلام میں اُن کو ہمیشہ بڑی بڑی مدد دی اور بڑی بڑی آفتیں اور الزام مسلمانوں پر سے ٹلوا دیئے اِس علم کے ذریعہ سے میں نے لوگوں کو بہت بڑا نفع پہنچایا۔ جس کو مدت تک وہاں کے لوگ بھول نہ جاویں گے۔ اور جن لوگوں کی پھانسیاں میری انگریزی دانی سے موقوف ہوئیں اور جان بچ گئی وہ تو تازیست اِس احسان کو فراموش نہ کریں گے۔ اور یہ بات بھی ایک بڑے تعجب کی ہے کہ جس دن میری رہائی کا حکم پہنچ کر مشتہر ہوا۔ اُسی دن ملازمانِ سرکاری کو عرضیوں کا لکھنا بھی قطعی منع ہو گیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ اجازت بھی فضلِ الٰہی سے مثل دوسرے نعماء ربی میری ہی ذات کے واسطے تھی۔ اب اگر کوئی ملازم سرکار بھولے سے بھی عرضی لکھ دیوے تو اسی دن اپنے عہدے سے برخاست ہو جاوے۔

میں نے انگریزی سیکھ کر بڑے بڑے کتب خانوں کی سیر کی۔ اور ہر علم و ہنر کی صدہا کتابیں دیکھیں دنیا کی کوئی زبان ایسی نہ ہو گی جس کی صرف نحو انگریزوں نے نہ لکھی ہو اور کوئی ملک ایسا نہ ہو گا جس کی تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ انگریزی زبان میں نہ ہو۔ انگریزی زبان علم اور فنون کا گھر ہے۔ جو انگریزی نہیں جانتا وہ بلاشبہ دنیا کے حالات سے بخوبی ماہر نہیں ہے۔ اور بے انگریزی سیکھے پکا دنیا دار و طرار نہیں ہو سکتا۔

اور نہ سوائے اُس زبان کے آج کل کوئی آلۂ زر کمانے کا ہے۔ مگر جس قدر یہ زبان دنیوی فوائد سے بھری ہوئی ہے اس سے زیادہ دین کے واسطے مضر بلکہ سم قاتل ہے۔ کوئی جوان لڑکا جس نے پہلے قرآن و حدیث اور سلوک راہِ نبوت میں خوب مہارت اور مشق نہ کری ہو اگر اس زبان کو سیکھ کر پوری طرح ہر قسم اور ہر علم کی کتابیں مطالعہ کیا کرے گا تو ضرور پرلے سرے کا بیحد آزاد، بد دین و بے ادب اور ملحد ہو جاوے گا بلکہ ایسا بے دین اور ملحد ہوگا کہ جس کا سنورنا محال کیا بلکہ غیر ممکن ہے۔

مغربی علوم کا ملحدانہ اثر

مگر فقط زبان انگریزی کا سیکھنا اِتنا مضر نہ ہوگا۔ صرف کتب بعض علوم کی جو تعلیم انبیاء علیہم السلام کے خلاف ہیں ایک ایسے شخص کو جو اُصول مذہب اِسلام سے پوری طرح واقف نہیں ہے ضرور بد دین اور ملحد کر دیویں گی۔ اور ایسے شکوک اس کے دل میں پیدا ہونگے کہ تا مرگ جن کا نکالنا محال ہے۔ اور بوجہ اسی مرض یا موت قلب کے ادائے عبادت میں بھی بہت سست ہو جاوے گا اور گو ظاہر میں وہ دعوئی اسلام کا کرے مگر فردِ اسلام

سے اس کا نام خارج ہو جاویگا اب باوجود میری اس دینداری کے پہلے میرا ہی حال سن لیجئے کہ اس علم کی بدولت مجھ پر کیا کیا اثر ہوئے۔ اسی علم کی بدولت میری نماز تہجد جس کا میں بچپن سے عادی تھا یک قلم چھوٹ گئی تھی۔ رات کو حسب عادت خود میں جاگ پڑتا تھا۔ مگر دو بجے شب سے فجر تک چارپائی پر بیٹھا رہتا۔ ہرگز ہمت نہ ہوتی کہ اٹھ کر وضو کروں یا نماز پڑھوں۔ نہ جمعہ میں نہ جماعت میں شامل ہوتا۔ نہ قرآن حدیث پڑھنے اور نہ سننے کو راغب ہوتا۔ ہر وقت انگریزی دیکھنے کو دل چاہتا کوئی گھڑی انگریزی کتاب پڑھنے سے خالی نہ رہتا۔ رمضان بھر میں چاہتا رہتا کہ تلاوت قرآن مجید کی کروں اور قرآن مجید کھول کر پڑھنے کو بھی بیٹھتا مگر پڑھا نہ جاتا۔ زبان پر قفل ہو جاتا تھا۔ جو دعا میں ہاتھ اٹھا کر گھنٹوں مانگا کرتا تھا اب اس خواب خرگوش میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ ہاتھ اٹھا کر چار کلمہ بھی زبان سے ادا نہ ہوتے تھے ہاتھ خود بخود گر جاتے تھے۔ ان ایام میں فقط فرض نماز پنجگانہ میں پڑھا کرتا تھا۔ اور اس کا ادا کرنا بھی پہاڑ سے زیادہ سخت تھا۔ اور قریب تھا کہ میں فرض نماز روزہ کو بھی جواب دے دوں۔ اور ان کے چھوڑ دینے اور عبث ہونے کے دلائل بھی شیطان مجھ کو تعلیم کیا کرتا تھا۔ قرآن مجید بقدر تین پارہ کے مجھ کو حفظ یاد تھا اس میں سے فقط اخیر کی چند سورتیں یاد رہ گئی تھیں اور باقی سب بھول گیا تھا صدہا حدیثیں بھی جو مجھے حفظ یاد تھیں وہ بھی گویا دل سے

کسی نے دھو ڈالی تھیں روز بروز ان بُرے عقائد اور زشت اعمال سے دل پر زنگ جمتا چلا جاتا اور یہاں تک میرا دل روگی اور مریض ہوگیا تھا کہ اس پر نزع کی حالت تھی اور قریب تھا کہ دل مُردہ ہوجاوے۔ اور طرہ یہ کہ اس حالت میں بھی شیطان ایسی ایسی وجوہات میرے دل پر نقش کیا کرتا تھا کہ میں اپنی اِس حالت کو بھی سب سے بہتر جانتا اور سمجھتا تھا کہ فقط اقرار کلمہ لاالہ الا اللہ جنت میں جانے کو بس ہے۔ یہ تکالیف شرعی سب بے فائدہ ہیں۔ اور یہ بھی مجھ کو یاد ہے کہ گلے ہے گاہے اِنکار حق تعالیٰ جو شیطان کا اصل مطلب ہے وہ بھی مجھ کو القا کیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی میں ملحد اور دہریوں کی دلائل کو دیکھتا تو خواہ نخواہ دل اُن کو قبول کرنا چاہتا۔ غرض مجھ میں اور کفر میں فقط چند انگشت کا فرق باقی تھا۔ اور قریب تھا کہ میں اس میں گر جاؤں۔ اور یہ کیفیت کوئی ایک دو دن نہیں رہی مگر بوجہ اجتبائے ازلی یا نیک اعمال سابقہ کے میں اپنے کو ہالک اور گمراہ سمجھ کر یہ دعا بھی اکثر مانگا کرتا تھا کہ "اے آنکھ والے مجھ اندھے کا ہاتھ پکڑ" آخر عنایت الٰہی اور تربیت واہبی نے پھر جوش مارا کہ دسمبر ۱۸۸۰ء میں یہ خاکسار ایک بیک بعارضہ ایک سخت دنبل کے جو میری جانگھ پر نکلا تھا بیمار شدید ہوا جس سے کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ ڈیڑھ مہینے تک اس سے سیروں پیپ جاری رہی۔ پانچ ہفتہ تک میں ہسپتال میں پڑا رہا۔ مرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ دوست آشنا سب مایوس ہوگئے تھے۔ اِس حالت مرض میں یہ خاکسار بہت گڑگڑایا۔ اور اپنی گذشتہ حالت سے

منفعل ہوکر پورا پورا تائب ہوا۔ اور عہد کیا کہ اس مرض سے شفا پاتے ہی نماز تہجد بھی شروع کر دوں گا۔ اور قرآن و حدیث کا بھی مطالعہ کیا کروں گا۔ مجھ کو اسی وقت آثار قبولیت دعا کے معلوم ہوئے اور اسی گھڑی سے دن کی حالت پلٹ گئی۔ آثارِ رحمت اور تربیت دہی کے ظاہر معلوم ہونے لگے۔ بھولا ہوا قرآن اور حدیث اور ادعیات ماثورہ آپ سے آپ یاد ہونے لگ گئیں۔ نماز اور دعا میں لذت اور حلاوت ملنے لگا۔ تب میں سمجھا کہ یہ بیماری محض میری اصلاح اور تربیت کے واسطے ہی تھی۔ ہسپتال سے واپس آکر میں نے پھر از سر نو حدیث اور تفسیر کو پڑھنا شروع کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں میری حالت پہلے سے بھی اچھی ہوگئی۔ پھر میں نے خیال کر کے دیکھا کہ جس قرآن و حدیث کے پڑھنے سے طبیعت گھبراتی تھی اور زبان پر ثقل ہو جاتا تھا۔ اور ایک دو آیت پڑھنا بھی محال اور دشوار تھا وہ اب میں دن بھر بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور اس کے پڑھنے سے طبیعت کو سرور اور دل کو لذت ہوتی ہے۔ اور وہ دعا جس کے واسطے ہاتھ اٹھانا محال تھا اب گھنٹوں مانگنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور اطاعت کی توفیق دینا یہ بھی ایک اس کا فضل ہے جس کو چاہے دیوے اور جس کو چاہے نہ دیوے۔

وہابیوں کے خلاف سرکار کا اعلانِ جنگ

وہابیوں کی گرفتاری کی جو آگ ۱۸۶۳ء میں تھانیسر میں روشن ہوئی تھی اس کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ خود ہمارے مسلمان اور ہندو بھائی بجائے بجھانے کے اس میں تیل اور تارپین ڈال کر بڑھاتے گئے۔ آخر لوڈاکٹر ہنٹر صاحب نے ہزار دس من ولایتی بارود اور کروسین آئل اس میں ڈال دیا۔ اور ہماری سرکار کو یہاں تک بھڑکایا کہ صادق پور پٹنہ کے وہ مکانات جن میں قافلہ کے لوگ ٹھیرا کرتے تھے معہ مکانات سکنی اُن فرضی باغیوں کے کھدوا کر پھینکوا دیئے مگر اس پر بھی سرکار کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ ۱۸۷۰ء کے اخیر تک پٹنہ اور بنگال میں سلسلہ گرفتاری بیگناہوں کا جاری رکھا۔ بیچارہ امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ بہت سے آدمی پٹنہ میں پکڑ لیئے۔ مولوی امیرالدین صاحب کو پٹنہ میں جا کر پکڑا۔ ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں اور اپنے معمولی اور پرانے گواہوں سے جو چاہا گواہی دلوا کر بیچاروں کو کالے پانی

میں روانہ کیا۔ اور امیر خاں کی جائداد سے اپنا کل خرچہ پورا کر لیا۔ اگرچہ اس امیر خاں کو باوجود دائم الحبسی کے چار برس بعد گورنمنٹ نے مفت کا احسان رکھ کے چھوڑ دیا۔ اور ایک حبہ جائداد منضبطہ سے واپس نہ دیا۔ اگر چار برس پہلے الزام سے بری ہو کر چھوٹ جاتا تو اپنی جائداد منضبطہ بھی سرکار سے واپس لے لیتا اس تعصب اور مفت کے احسان کی طرف غور کر کے دیکھئے کہ اگر امیر خاں مذکور ایسا بھاری مجرم تھا جیسا کہ ملاحظہ مثل مقدمہ سے ثابت ہے تو ایسے بھاری مجرم کو چار برس بعد کیوں رہا کر دیا۔ اور اگر وہ قصوروار نہیں تھا جیسا کہ اس کی جلدی رہائی سے ظاہر ہے تو کس واسطے اتنے بھاری اہتمام سے اس کو قید کر کے اس کی جائداد ضبط کی تھی؟

مارچ ۱۸۷۰ء میں مولوی تبارک علی صاحب اور مولوی امیر الدین صاحب بھی ہمارے پاس کالے پانی میں پہنچے۔ مگر بوجہ اجراء قانون جدید سختی کے بیچاروں کو مدت تک سخت مشقت کرنی پڑی۔ لیکن بفضل الٰہی کچھ عرصہ کے بعد مولوی تبارک علی صاحب اسٹیشن محرر اور مولوی امیر الدین صاحب معلم مدرسہ مقرر ہو گئے اور فقط دس برس قید کاٹنے کے بعد بتوجہ و فیض بخشی لارڈ رپن صاحب بہادر ہمارے ساتھ ہی رہا ہو کر اپنے اپنے گھر کو واپس آ گئے۔ اور وہ ان کی سختی مشقت قید کی کمی ایام قید میں مجرا ہو کر ہمارے برابر ہو گئے۔ جب دس برس تک بھی یہ سلسلہ گرفتاری وہابیان بند نہ ہوا تو میں اپنے بد اعمال کو یاد کر کے بہت

کڑھا کرتا تھا کہ یہ آگ تیرے گھر سے نکلی اور تیرے بداعمالیوں کے سبب سے دس برس سے تمام ہند میں ہزارہا علما و شرفا گرفتار پنجۂ مصیبت ہیں۔ اگر تجھ سا منحوس بدبخت نہ پیدا ہوا ہوتا یا بچپن ہی میں مرجاتا تو یہ آفت اور مصیبت مسلمانوں پر نہ پڑتی ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

مارچ ۱۸۶۷ء میں اسی جہاز میں جس میں مولوی تبارک علی اور مولوی امیرالدین صاحب آئے تھے۔ میاں عبدالغفار کی بی بی اور اون کے دو لڑکے بھی بحکم سرکار کالے پانی میں پہنچے۔ میاں عبدالغفار نے بذریعہ چیف کمشنر پورٹ بلیر کے سرکار سے درخواست کی تھی کہ میری بیوی اور بچے ہند سے بلادیئے جاویں۔ صدآفریں بنگال گورنمنٹ پر کہ اس نے اپنے خرچ سے ایسے باغی کے بیوی بچوں کو کالے پانی میں پہنچوادیا۔

سرکار کا یہ غصہ اور وہابیوں کو دھڑادھڑ دس برس تک دریا برد کرتے رہنے سے یہ غرض تھی کہ وہابیوں کا قلع قمع ہند سے کیا جاوے اور ان کا بیج ناس ہو جاوے سو میں نے کالے پانی سے واپس آکر اس کے برعکس دیکھا۔ میری موجودگی ہند کے وقت شاید پنجاب بھر میں دس وہابی عقیدے کے مسلمان بھی موجود نہ تھے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ گاؤں اور شہر

ایسا نہیں ہے کہ جہاں کے مسلمانوں میں کم سے کم چہارم حصہ وہابی معتقد مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے نہ ہوں۔ یوماً فیوماً یہ فرقہ ایسا بڑھ رہا ہے جیسے ایک وقت پر پراٹسٹنٹ یک بیک تمام یورپ میں بڑھ گئے تھے۔ اور کوئی عذاب اور شکنجہ کشی اور سولی اور پھانسی اور جلا وطنی اور آگ میں زندوں کو جلا دینا اُن کی ترقی کو مانع نہ ہوا تھا۔ بلکہ تجربوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فرقہ کی ترقی کو مانع ہونا اور اس میں تشدد کرنا سب سے زیادہ قوی سبب اُس کی ترقی وجاہ و جلال کا ہوتا ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ تھوڑے دن کی بات ہے کہ جب سکھوں کا فرقہ نکلا اور اس کی ترقی شروع ہوئی تو مغلوں نے کس قدر اس کے نیست و نابود کرنے کے علاج کئے۔ مگر خدا کے بڑھائے ہوئے کو کون روک سکتا ہے؟ آخر وہی سکھ ہیں جنھوں نے پشاور سے دہلی تک مغلوں کی سلطنت چھین لی۔ اور سو برس تک بڑے جلال اور اقبال سے راج کیا۔ اِدھر ملک دکن میں مرہٹوں کا یہی حال سمجھو۔ جتنا روکا اتنا ہی بڑھتے گئے۔ خداوند تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ میں دست اندازی کرنا اپنے کو ہلاک کرنے کا سامان ہے۔

اَولاد

۱۲ اپریل ۱۸۶۲ء کو میری بڑی لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کے عقیقے کا

کھانا بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ اور مولوی تبارک علی صاحب اور مولوی امیرالدین صاحب جن کو وہاں پہنچ کر صرف پندرہ دن ہوئے تھے اس عقیقے میں شامل تھے۔ اس کے بعد میری دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ مارے محبت کے اس کا نام میں نے اپنی ہندوستان کی لڑکی کے نام پر رکھا تھا اس کے عقیقے کا کھانا بھی ویسا ہی دھوم دھام سے ہوا۔ اس کے بعد پھر تیسرا بچہ محمد صادق ۲۶ ہر نومبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوا۔ اس کا نام بھی میں نے اپنے ہندوستان کے لڑکے کے نام پر رکھا تھا۔ اس لڑکے کی پیدائش کے وقت ایک عجیب اسرار الٰہی جو غالباً میری تسلی کے واسطے تھا ظاہر ہوا۔ جس دن یہ لڑکا کالے پانی میں پیدا ہوا اسی دن بلکہ اسی وقت میرا بڑا لڑکا محمد صادق پانی پت میں فوت ہوگیا۔ جب اس کی وفات کی خبر مجھ کو پہنچی میں نے اس کا نعم البدل اس کے ہم نام اپنے پاس دیکھ کر صبر شکر کیا۔ اور اس کی والدہ کو بھی اس کا نعم البدل اور ہم نام مل جانے کی خبر لکھ بھیجی۔

جب میں نے انگریزی سیکھی تو ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی کتاب "انڈین مسلمان" دیکھنے کا بڑا شوق ہوا۔ بمشکل تمام سات روپیہ قیمت کو کلکتہ سے ایک جلد طبع دوم کی میں نے منگوائی۔ اور اس کا مطالعہ کیا تو ایک مقام پر دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑی لمبی چوڑی تمہید باندھ کر لکھا ہے کہ اگر بنظر ترحم خسروانہ سرکار کبھی ان وہابیوں کو کالے پانی سے رہائی بھی دیوے تو یہ لوگ اپنی رہائی کو

منجانب اللہ جل جلالہٗ سمجھ کر ہند کو واپس آنے کے بعد بھی اور زیادہ موجبِ تخریب
اور بربادی سلطنت انگریزی کے ہونگے؟ پہلے ہی سے سرکار کا غصہ دیکھ کر ہم
رہائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ یہ مضمون زہر آمیز دیکھ کر رہی سہی امید بھی جاتی
رہی۔ اور اس کے بعد جب گورنمنٹ ہند کے قواعد رہائی قیدیان دائم الحبس
بعد انقضائے بیس برس تاریخ قید سے جاری کئے تو اس میں بھی ہمارا مقدمہ
رہائی سے مستثنیٰ ہو گیا تھا۔ اور ان سب سے بڑھ کر نا امیدی اس وقت
ہوئی تھی کہ جب سنہ ۱۸۸۱ء خود ڈاکٹر ہنٹر صاحب مؤلف کتاب مذکور گورنر جنرل
ہند کے مصاحب مقرر ہو گئے۔ تب ہم نے جانا کہ جس کی کتاب کو ایک دفعہ
مطالعہ کر کے بڑے سے بڑا دانا انگریز ساری عمر کے واسطے ہمارا دشمن جانی
ہو جاتا ہے۔ تو ان کی موجودگی محکمہ گورنری میں ہماری رہائی تو کیا نہ معلوم
ہم پر اور کیا آفت لا دے گی۔

رہائی کی امیدیں

لیکن با ایں ہمہ سنہ ۱۸۸۰ء سے یہ بات غیب سے دل میں ملہم ہوتی تھی
کہ ہم جلد رہا ہو کر ہند کو جانے والے ہیں۔ میں نے مولوی انوار الاسلام اور

اور حافظ محمد اکبر پانی پتی کو خطوط بھی لکھ دیئے تھے کہ میں جلد ہند کو آیا چاہتا ہوں۔

جون ۱۸۷۶ء میں یہ خاکسار میر منشی ضلع جنوبی پورٹ بلیر کا مقرر ہو کر ابرڈین کو بدل گیا۔ اور اپنے پرانے آقا اور رشا گرد میجر پاتھر و صاحب ڈپٹی کمشنر کا میر منشی ہوا۔ جہاں اپنی رہائی اور روانگی کی تاریخ تک برابر اسی عہدہ پر قائم رہا۔ اس صاحب نے میری اعانت سے پورٹ بلیر کے آئین کی کتاب بھی بنائی۔ جو بعد منظوری گورنمنٹ کے مشتہر بھی ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی خود میں نے ہی لکھا تھا اور وہ بھی چھپ چکا ہے۔ میری چودہ برس کی عمدہ کارگذاریوں اور جانفشانیوں پر نظر توجہ ہو کر اسی صاحب کی تحریک سے بڑی دھوم دھام سے ایک لمبی چوڑی گورنمنٹ ہند کو میری رہائی کی رپورٹ بھی ہوئی تھی۔ اس رپورٹ پر رہائی تو کیا ہونی تھی مگر سکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ اس قدر ناراض ہوا کہ تاحیات میری رہائی غیر ممکن ہو گئی اور دوبارہ کسی افسر کو میری رہائی کی رپورٹ کرنے کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ ۱۸۸۰ء کے اخیر میں مولوی عبدالفتاح پسر مولوی عبدالرحیم اپنے والد کی ملاقات کے واسطے پورٹ بلیر میں پہنچے اور کوئی ایک برس تک وہاں رہ کر پھر ملک ہند کو واپس چلے گئے اُسوقت مولوی عبدالرحیم صاحب نے ایک مسودہ عرضی اپنی رہائی کے واسطے لکھوا کر اپنے بیٹے کی معرفت سے ہند کو روانہ کیا تھا کہ جس سے وہاں ایک عرضی

اِس مسودہ کے موافق اُن کی بیوی کی طرف سے تیار ہو کر بحضور گورنر جنرل ہند اپریل ۱۸۸۳ء میں پیش ہوئی۔ جس میں یہ بیان تھا کہ میرے شوہر پر دراصل کچھ بھاری قصور ثابت نہ ہوا تھا۔ اِس واسطے بروقت تجویز مقدمہ سشن جج اور نیز چیف کورٹ نے یہ ارشاد کیا تھا کہ بشرط نیک چلنی بعد ۱۴ برس کے عبدالرحیم کے مقدمہ میں نظر ثانی کیجاوے گی سو اب تو اٹھارہ برس ہو گئے میں نے اس کی جدائی میں بہت تکلیف اُٹھائی۔ اور وہ بھی بہت بوڑھا ہو گیا سرکار اب اس کو بعد ملاحظہ مِثل کے رہائی بخشے۔"

بعد ملاحظہ اِس عرضی کے لارڈ رپن صاحب بہادر نے سوائے طلبی مِثل مقدمہ کے پنجاب اور بنگال گورنمنٹ سے رائے بھی طلب کی کہ اگر ان وہابیوں کو رہائی دیجاوے تو کچھ قباحت تو نہیں ہے؟ بعد آنے رائے لوکل حکام کے مقدمہ مذکور تا شروع سال آیندہ کے ملتوی ہو گیا چونکہ یہ عرضی فقط مولوی عبدالرحیم صاحب کے واسطے تھی اور دراصل اُن کا قصور بھی نہ تھا فقط فرضی مفسدوں کی اولاد تصور ہو کر بردہ فروشی قید کئے گئے تھے۔ اِس واسطے ہم لوگوں کو فقط اُن کی رہائی کا انتظار تھا۔ اِس ذریعہ سے اپنی رہائی کا تو کچھ گمان بھی نہ تھا۔ ہمارے اخیر دفعہ میں سب بنگال کورٹ کے صاحب لوگ پورٹ بلیر میں جمع ہو گئے تھے۔ اس سبب سے ان کو تعصب بھی ہم لوگوں سے زیادہ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں

بوجہ پیری اور ضعف کے مولوی احمد اللہ صاحب جن کی عمر اس وقت اسی سال کے قریب تھی بہت نحیف قابل رحم دشمنان ہو گئے۔ انھوں نے اپنی یہ حالت زار دیکھ کر اپنے بیٹے مولوی محمد یقین صاحب سے جو کلکتہ میں مقیم تھے بلا کر ملاقات کرنی چاہی۔ حالانکہ بموجب قاعدۂ عام پورٹ بلیر کے یہ یہ ملاقات جائز اور درست تھی اور سینکڑوں بیٹے اپنے باپوں سے آکر مل گئے مگر فقط اِس سبب سے کہ احمد اللہ وہابی ہے ان کی یہ درخواست نامنظور ہو گئی۔ اس مابین میں اِمتحاناً میں نے بھی ایک درخواست کی تھی کہ محمد رشید میرے حقیقی برادر زاد کو میرے پاس پورٹ بلیر میں آنے کی اجازت بخشی جاوے۔ حالانکہ یہ درخواست بھی سراسر قابل منظوری کے تھی مگر فقط اِس سبب سے کہ سائل وہابی ہے وہ بھی نامنظور ہو گئی۔

حضرت مولٰنا احمد اللہ صاحب کا انتقال

جب مولوی احمد اللہ صاحب نہایت کمزور اور چراغ سحری ہو گئے تو

مولوی عبدالرحیم صاحب نے ان کی حالت اور کمزوری بیان کرکے حکام کو لکھا کہ میں اُن کا رشتہ دار قریب ہوں۔ دیہہ میں کوئی ان کی خبرگیری کرنیوالا نہیں ہے۔ اِس واسطے اُمیدوار ہوں کہ ان کو ابرڈین میں میرے گھر پہ رہنے کی اِجازت بخشی جاوے یہ درخواست بھی جس کے پڑھنے سے سنگدل کا دل نرم ہو جاوے فقط اس وجہ سے نامنظور کی گئی کہ احمداللہ اور عبدالرحیم دونوں وہابی ہیں۔ اُن کے ساتھ ایسی رعایت اور مہربانی نہیں ہوسکتی۔ جب مولوی صاحب موصوف کا حال نہایت پتلا ہوا۔ اور صاحب لوگوں کے تعصب کا یہ حال تھا تو مولوی عبدالرحیم صاحب نے یہ اجازت چاہی کہ مجھ کو رات دیہہ میں ان کے پاس رہنے کی اجازت بخشی جاوئے۔ سو یہ درخواست بعد بڑی دریافت اور بحث کے منظور ہو کر مولوی عبدالرحیم صاحب کو ۱۲ ہر نومبر کو شام کے وقت ایک تحریری پاس ملا۔ اور اسی رات واقعہ ۲۱ ہر نومبر ۱۸۸۱ء مطابق ۲۸ ہر محرم ۱۲۹۸ھ شب دوشنبہ کو بوقت ایک بجے رات کے مولوی صاحب موصوف کی روح اِس جسم قید در قید کو چھوڑ کر فردوس برین کو پرواز کر گئی۔ مولوی صاحب کی وفات کے وقت عبدالواحد نام ایک ملازم مولوی صاحب موصوف کا ان کے پاس ہسپتال میں حاضر تھا مرنے کے وقت مولوی صاحب نے جو پہلے چند روز سے عالم بیہوشی میں تھے آنکھ کھول کر

الا اللہ یا مالک الملک آخری کلمہ فرمایا اور سرد ہو گئے۔ ۲۱ مہ تاریخ کو بوقت
آٹھ بجے فجر کے بمقام ابرڈین ہم لوگوں کو اطلاع ہوئی۔ ہم سب آدمی بمعہ
بہت سے دوستوں کے نو بجے فجر کے دیپیر میں پہنچ گئے۔ میں کچہری ضلع میں
منشی تھا اور بلا اجازت صاحب ضلع کے جا نہیں سکتا تھا۔ اور بوجہ تعصب
حکام اجازت ملنا محال تھا اور مجھ کو ان کی تجہیز و تکفین میں شامل ہونا
ضرور رہوا۔ اس واسطے میں متوکل مولیٰ بلا اجازت دیپیر کو چلا گیا۔ اور ایک
عرضی اطلاعی بھیجدی کہ میں احمد اللہ صاحب کی تجہیز و تکفین میں شامل ہونے
کو دیپیر جاتا ہوں آج کی میری غیر حاضری معاف فرمائی جاوے۔ ہم نے دیپیر
پہنچکر آخری درخواست حکام انگریزی سے یہ بھی کر دیکھی کہ ہم کو اجازت بخشی
جاوے کہ مولوی احمد اللہ صاحب کی لاش کو ابرڈین میں لیجا کر اُن کے سگے
بھائی مولوی یحییٰ علی صاحب کی قبر کے متصل دفن کر دیویں۔ یہ درخواست
بھی نا منظور رہو گئی۔ تو ناچار بعد غسل و نماز کے ان کی لاش کو لیجا کر گورغریباں
واقعہ ڈنڈاس پلینٹ میں جو دیپیر سے تھوڑی دور ہے دفن کر دیا۔

اپنے تجربات بست سالہ میں میں نے یہ بھی اکثر دیکھا کہ جب کبھی
کسی افسر یا حاکم کی مدد پر میں نے بھروسا کیا اور خدا کی طرف توجہ نہ رکھی
تو میرے رب نے اسی خیالی معاون کے ہاتھ سے مجھ کو ایذا پہنچوانے
کا بندوبست کر دیا۔ مگر جب میں نے اُس خیال سے تائب ہو کر اُس

ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی طرف رجوع کیا تو پھر اُس غالب زبردست حکمت والے نے میری مدد کی اور آفت سے نجات بخشی۔ اور جو لوگ پہلے سے میرے دشمن تھے اور جن سے میں ڈرتا تھا اُن کو میری مدد کی اور آفت سے نجات بخشی۔ اور جو لوگ پہلے سے میرے دشمن تھے اور جن سے میں ڈرتا تھا اُن کو میری مدد اور پشت و پناہ پر کھڑا کر دیا۔ خداوند تعالیٰ کو کسی طرح بھی منظور نہیں ہے کہ میں اس کی طرف سے توجہ پھرا کر غیر اللہ کی طرف رجوع کروں۔ وہ رب العزت ہمیشہ مجھ کو مار مار کر تنبیہہ کر کے شرک سے بچا کر اپنی طرف رجوع کراتا رہا ہے۔

ستمبر ۱۸۸۰ء میں لاچار ہو کر میری ہندوستان کی بیوی نے پانی پت سے مجھ کو لکھا کہ میری بڑی لڑکی جوان ہو گئی۔ تمہاری رہائی کی اُمید پر آج تک اس کی شادی کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ اب بظاہر کوئی شکل تمہاری رہائی کی ایسی جلدی نہیں ہے۔ اس واسطے اگر اجازت دو تو کسی جگہ اس کی شادی کا بندوبست کیا جاوے اور اس کے جہیز کے واسطے کچھ خرچ ضروری بھی بھیجدو میں نے ۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو گویا تاریخ حکم رہائی سے اڑھائی ماہ پہلے بقدر تین سو روپیہ نقد و زیور وغیرہ پانی پت کو بھیجدیا۔ اور اپنی بیوی کو لکھا کہ تم کسی دیندار مسلمان سے اس لڑکی کی شادی کر دو۔

فرمان رہائی

جب میرا بھیجا ہوا اسباب اور خط پانی پت میں پہنچا تو بوجہ میرے اس شادی میں شامل نہ ہونے کے بجائے شادی کے غم ان لوگوں کو ہو گیا۔ اور میری بیوی اور لڑکی رو رو کر دعائیں کرتی تھیں کہ "اے قادر کریم! اس کو بھی اس شادی میں شریک کر۔" بظاہر کوئی سامان میری رہائی کا اس وقت نہ تھا مگر اس مستجاب الدعوات نے وہ فریاد اُن کی اسی دم قبول کر لی۔ ۳۰ ہر دسمبر ۱۸۸۲ء کو بلا عرضی اور درخواست اور بلا سعی سفارش میری رہائی ہو کر مجھ سے پہلے پانی پت میں میری بیوی کو اطلاع ہو گئی۔ اب جو میری رہائی کا زمانہ قریب آیا تو میں ہر اگنبوٹ میں اپنی رہائی کا منتظر رہتا تھا۔ اور اس ملک کے تحفے تحائف جمع کر کے چلنے کو تیار بیٹھا تھا۔ گو بہت سے لوگ جو میرے مقدمہ اور جواب محکمہ گورنری سے واقف تھے میری اس تیاری کو دیکھ کر مجھ پر ہنستے تھے۔ آخر ۲۲ ہر جنوری ۱۸۸۳ء روز دوشنبہ کو مہارانی نام اگنبوٹ یہ حکم لے کر پہنچا کہ جس قدر آدمی بجرم بغاوت وہابی کیس میں قید ہیں سب یک قلم رہا کر کے ہند کو روانہ کر دیئے جاویں۔ اُن کی ارکل گورنمنٹ اُن کی سکونت کے واسطے بندوبست معقول

کرے گی۔ جب یہ حکم وہاں پہنچا تو میں اور مولوی عبدالرحیم صاحب و میاں عبدالغفار و مولوی تبارک علی و مولوی امیرالدین اور یہاں مسعود گل ۶ نفر اس مقدمہ کے وہاں موجود تھے۔ سو سب کی رہائی ہوگئی۔

جب یہ حکم بذریعہ اخباروں کے ہند میں مشہور ہوا تو بوجہ حمیت اسلامی جملہ انجمن و مجلس ہائے اسلام نے اس ترحم خسروانہ لارڈ رپن صاحب بہادر پر بذریعہ میموریل کے ان کا شکریہ ادا کیا جیسے ہماری گرفتاری پر گھر گھر تمام ہند میں واویلا مچ گیا تھا ویسے ہی گھر گھر خوشی اور شکریہ کی مجلسیں منعقد ہوئیں۔ اور لارڈ رپن صاحب کی مداحی اور شکرگذاری سے ہماری زبان اور قلم کبھی قاصر ہوگی جس کی اولوالعزم اور ترحمانہ پالیسی سے ہم کو ہند دیکھنا پھر نصیب ہوا۔ اسی عرصہ میں میرے ایک پرانے شاگرد کپتان ٹمپل صاحب نے جو بر وقت میری رہائی کے خاص کیمپ انبالہ میں مجسٹریٹ تھے میری رہائی کی خبر پا کر مجھ کو لکھا کہ اگر تم میرے پاس رہنا قبول کرو تو میں گورنمنٹ سے اجازت لے کر تم کو اپنے پاس بلا لوں میں نے اس پیام کو تائید غیبی سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔ تب انھوں نے گورنمنٹ پنجاب سے اجازت حاصل کر کے اور خود میرے ضامن ہو کر کل شرائط نگرانی وغیرہ میرے اوپر سے اٹھوا دیں۔ جب میری رہائی کا حکم پورٹ بلیر میں آیا تو میری بیوی خوردہ دائم الحبس تھی اور اس وقت اس کو فقط چودہ برس قید میں ہوئے تھے۔ اس واسطے اسی اگنبوٹ میں گورنمنٹ کو اطلاع دی گئی کہ جب تک

محمد جعفر کی بیوی رہا نہ ہوگی وہ ہند کو نہیں جا سکتا۔ اور اپنی رہائی کا حکم پاکر اسی وقت میں نے بھی گورنمنٹ پنجاب کو لکھا کہ یہاں نہایت عمدہ میرا گھر موجود ہے اور میں سو روپیہ ماہوار کا نوکر ہوں۔ اور ہند میں نہ میرا گھر ہے اور نہ مکان۔ اور غالباً حکام پنجاب میرے وہاں آنے پر مجھ سے ناحق چھیڑ چھاڑ کیا کریں گے اور مجھ کو قیدی سابق سمجھ کر کوئی نوکری وغیرہ بھی نہ دیویں گے۔ اس واسطے میں امیدوار ہوں کہ وقتاً فوقتاً ہند میں جاکر اپنے بال بچوں کو دیکھ آیا کروں گا گو چیف کمشنر صاحب پورٹ بلیر نے بعد اظہار نیک چلنی اور عمدہ کارگذاری کے پھر سفارش بھی کی تھی کہ محمد جعفر کے واسطے کسی خاص طور پر سرکار سے اندازہ مقرر کیا جاوے۔ تب ملک ہند میں اس کی گذران ہو سکتی ہے۔ لیکن گورنمنٹ پنجاب نے میری اس درخواست کو نامنظور کر کے جبراً مجھ کو اور میرے بال بچوں کو ہند میں بلایا۔ مگر یہ وعدہ کیا کہ یہاں پنجاب میں اس کو نوکری مل سکتی ہے۔

۳ مارچ ۱۸۸۳ء کو مولوی عبدالرحیم و میاں عبدالغفار و مولوی امیرالدین صاحب و تبارک علی روانہ ہند ہو گئے اور بخیریت تمام اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ۲۸ مارچ اپریل ۱۸۸۳ء کو میاں مسعود بھی چلے گئے۔ فقط میں اکیلا بانتظار حکم رہائی اپنی بیوی کے رہ گیا۔ یکم مئی ۱۸۸۳ء کو میری بیوی کی رہائی بھی آگئی۔ مگر اس وقت میری بیوی کو چھ مہینے کا حمل تھا۔ اور سمندر میں موسم طوفان کا شروع ہو گیا تھا۔ اس واسطے میں نے تا ماہ نومبر ۱۸۸۳ء مطابق محرم ۱۳۰۱ھ پورٹ بلیر میں رہنے کی

اجازت حاصل کرلی۔ اس مہلت میں میں نے اپنے گھر کا اسباب فروخت کرنا شروع کیا۔ اور اُونے پونے پر جیسے ہوا بیچ ڈالا۔ اکتوبر ۱۸۸۳ء میں میں نے چاہا کہ میرا گھر چوبی جس میں میں رہتا تھا مسجد بنا کر فی سبیل اللہ وقف کر دیا جاوے اور سب مسلمان جو بغیر مسجد کے تکلیف اُٹھاتے تھے اس وقف سے بہت خوش ہوئے مگر میجر ہرپچ صاحب ڈپٹی کمشنر نے از راہِ تعصب کے یہ رپورٹ کر دی کہ یہ شخص وہابی ہے اور یہ مسجد بھی وہابیوں کے قبضہ میں رہے گی۔ اس لیے یہاں مسجد بنانے کی اجازت نہ دی جاوے۔ پس وہی تعصب وہابیت کا اس کارِ خیر کو بھی مانع ہوا۔

پورٹ بلیر پر آخری نظر

جیساکہ میں نے اپنے پورٹ بلیر میں داخل ہونے کا ذکر کرنے کے بعد حالات متعلقہ جغرافیہ و قدیم باشندگان بیان کئے ہیں۔ اس مقام پر اپنے پورٹ بلیر کے روانہ ہونے کے ذکر کے پہلے قوانین و اوضاع و اطوار ساکنانِ پورٹ بلیر کو ذکر کر کے اس جزیرے سے کوچ کروں۔ یہ جزیرہ مثل دوسرے اضلاع کے ایک مستقل ضلع گو ذرا مختلف ہے۔ صاحب چیف کمشنر انڈمان کو اختیار ہے کہ جو

ایکٹ چاہیں یہاں جاری کردیویں۔ اور جس حاکم ماتحت کو جو چاہیں اختیارات دیوانی یا فوجداری کے عطا کریں۔ یہاں کا چیف کمشنر اِس قسمت کا سشن جج بھی ہے یہاں کے چیف کمشنر کا حکم ناطق ہے۔ اُس کا کچھ اپیل نہیں ہو سکتا۔ صرف مقدمات پھانسی میں گورنر جنرل اجلاس کونسل کی منظوری لی جاتی ہے۔ باقی اور سب اُمور دیوانی اور فوجداری میں یہاں کا چیف کمشنر ہائی کورٹ بھی ہے۔ یہاں کوئی جہاز یا مسافر کوئی مال واسباب بلا اجازت صاحب چیف کمشنر بہادر کے نہیں آسکتا۔ اور نہ کوئی آدمی بلا اجازت صاحب موصوف کے اس ٹاپو سے جا سکتا ہے۔ یہاں کا چیف کمشنر صدر مقام رودس میں رہتا ہے۔ اس کی تنخواہ تین ہزار روپیہ ماہوار ہے۔ یہ قسمت دو ضلعوں میں تقسیم ہے۔ ایک ضلع جنوبی جس کا صدر مقام ابرڈین ہے دوسرا شمالی جس کا صدر مقام چاٹم ہے دونوں صاحب ضلعوں کے ماتحت دوسرے بہت سے اسسٹنٹ اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کام کرتے ہیں اس سٹلمنٹ کے دستور العمل اور قواعد ابتداء ۱۸۵۸ء سے اب تک وقتاً فوقتاً بہت بدلتے رہے ہیں اور ہمیشہ زود سختی و جبر ہیں۔ اور "ہر کہ آمد براں مزید کند" پر یہاں خوب عمل ہوتا ہے۔ یہاں قریب دو ہزار قیدی کے سالانہ ہند سے نئے قید ہو کر آتے ہیں۔ اور اس وقت قریب چودہ ہزار قیدی کے یہاں موجود ہیں۔ جہاز سے اُترنے کے ۱۹ ایک مہینہ بعد ان کی بیڑی کٹ جاتی ہے۔ یہاں کوئی جیل نہیں ہے۔ بارکوں میں

یہ قیدی ماتحت قیدی افسروں کے رہتے ہیں۔ دن میں مثل جیل ہائے ہند قیدی سخت مشقت کرتے ہیں۔ دو وقت ان کو پختہ کھانا ملتا ہے۔ رات کو انھیں بارکوں میں سو رہتے ہیں۔ ان بارکوں کی حفاظت پر سوائے قیدی افسروں کے اور کوئی پولیس یا جنگی پلٹن نہیں ہے۔ غرض قیدیوں کی حفاظت اور نگرانی اور ان کو کام پر تقسیم کرنا اور ان سے کام کروانا یہ سب پرانے قیدی افسروں کے سپرد ہے جو سر پر لال دوپٹہ اور گلے میں چپراس ڈال کر رہتے ہیں اور حسب مدارج اپنے عہدوں کے سوا خوراک کے نقد تنخواہ بھی سرکار سے پاتے ہیں۔ ان نئے قیدیوں کو بھی بشرط نیک چلنی تین چار برس کے بعد کسی قدر تنخواہ ملنے لگ جاتی ہے اور بعد تنخواہ پانے کے یہ نئے قیدی بھی پٹے والے افسر مقرر ہو جاتے ہیں دس برس نیک چلن رہنے کے بعد ہر ایک مرد قیدی مستحق ٹکٹ پانے کا ہو جاتا ہے اور ٹکٹ یہ ہے کہ قیدی آزاد ہو کر بارک سے نکل جاتا ہے۔ اور شہر اور بستیوں میں رہ کر جو چاہے پیشہ کرے اور کھاوے کماوے۔ قریب پچاس ساٹھ کے قیدیوں کی بستیاں آباد ہیں۔ جن میں قیدی ہی نمبردار اور چوکیدار و پٹواری ہیں۔ جو لوگ کھیتی کرنے کا ٹکٹ لیتے ہیں اُن کو گاؤں میں نو توڑ زمین بقدر ۱۵ ایکڑ کے مفت سرکار سے مل جاتی ہے اور تین برس تک محصول معاف رہتا ہے اور کبھی کبھی کچھ مدد ملتی ہے۔ اس ٹکٹ پانے کے بعد قیدی آزاد ہو جاتا ہے جو چاہے سو کرے۔

جو عورتیں قید ہو کر آتی ہیں وہ ایک علیحدہ جزیرہ میں ماتحت قیدی عورات افسر کی
کے بارک میں رہتی ہیں۔ عورتوں کو بھی اپنی بارک کے اندر پسائی سلائی وغیرہ
کی مشقت کرنی ہوتی ہے۔ عورتوں کو پانچ برس کے بعد ٹکٹ آزادی کا مِل
جاتا ہے۔ لیکن جوان عورتیں جب تک شادی نہ کر لیویں ٹکٹ پاکر اپنی بارک
سے باہر نہیں جانے پاتیں۔ بعد انقضائے پانچ برس مدت قید کے عورت
کو اختیار رہے جس مرد سے چاہے شادی کر لیوے۔ مردوں میں سوائے
ٹکٹ والوں کے مشقتی بارک باش قیدی شادی نہیں کر سکتے۔ جس مرد کو
شادی کرنا منظور ہوتا ہے وہ عورتوں کے ٹاپو میں جا کر کسی عورت کو پسند
کر کے کچھ اُن کو دے دلا کر راضی کر لیتا ہے اور جب میاں بیوی راضی ہو جاتے
ہیں تو ان کو ایک اقرار نامہ اپنی رضامندی اور محبت و موافقت سے مِل کر
رہنے کا روبروئے صاحب چیف کمشنر بہادر کے لکھ دینا پڑتا ہے۔ اس کے
بعد بیوی میاں کے گھر چلی آتی ہے۔ ٹکٹ والے قیدی ملک سے اپنے
بال بچوں کو بھی بلا سکتے ہیں۔ جب کوئی قیدی بیس برس تک نیک چلن رہے
تو پھر اس کی رہائی بھی ہو جاتی ہے۔ اور اس کو بعد رہائی کے اختیار رہے
چاہے اس ملک میں رہے چاہے اپنے وطن اور زاد بوم کو چلا آوے۔ بعد
ٹکٹ پانے کے قیدیوں کو اختیار رہے کہ اپنی کمائی حلال سے چاہیں لاکھوں روپیہ
جمع کر لیویں مگر ٹکٹ سے پہلے بلا اطلاع و اجازت حکام وہ نہ کچھ اپنے پاس رکھ

سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کے پاس جمع کر سکتا ہے۔ قیدی جب تک بارک میں رہکر مشقت کرتے ہیں ایک برس یا تین مہینے میں ایک خط اپنے گھر کو بھیج سکتے اور ایک خط آمدۂ ہند پا سکتے ہیں۔ مگر ٹکٹ والے ہر مہینے میں ایک خط بھیج سکتے اور ایک منگا سکتے ہیں۔

پورٹ بلیر ایک ایسی جگہ ہے کہ جہاں چینا، برہما، ملائی، سنگلی، جنگلی، نکوباری، کشمیری، پشتونی، ایرانی، مکرانی، عربی، حبشی، پارسی، پرتگیز، امریکن، انگریزی، ڈین، فرنچ، وغیرہ اور ہندوستان کے سب ضلعوں اور شہروں کے آدمی شل بھوٹیا، نیپالی، پنجابی، سندھی، گجراتی، دیس والے ہندوستانی اہل برج، آسامی، تھلی، بند، ملکھنڈی، اوڑیا تلنگی، مرہٹے، کرناٹکی، مدراسی ملیالم، گونڈ، بھیل، بنگالی، گول، سنتال، وغیرہ سب موجود ہیں۔ جب یہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں۔ تو اپنی اپنی زبان میں بات چیت کرتے ہیں، مگر بازار اور کچہریوں کی زبان یہاں بھی ہندوستانی ہے۔ ہر ملک کا آدمی یہاں آکر آپ سے آپ ہندوستانی زبان سیکھ لیتا ہے۔ کیونکہ بغیر اس زبان جاننے کے یہاں آدمی کا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں پردۂ زمین پر کوئی دوسرا مقام ایسی مختلف قوموں سے آباد نہ ہوگا۔ قریب چالیس مختلف قوموں کے جو ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں یہاں موجود ہیں۔ شان الہٰی سے یہاں ایک ایسا میلہ جمع ہوا ہے شاید آج تک پردۂ زمین پر ایسا مجمع کہیں نہ جمع ہوا

ہوگا۔ جب کوئی بنگالی مرد اور مدراسی عورت یا بھوٹیا مرد اور پنجابی عورت وعلی ہذا القیاس آپس میں شادی کرتے ہیں اور میاں بیوی کی اور بیوی میاں کی بات نہیں سمجھتے۔ اور ہر وقت تکرار اور لڑائی باہمی کے دونوں اپنی اپنی زبان میں ایک دوسرے کو گالی دیتے ہیں اور فریق ثانی کچھ نہیں سمجھتا تو عجب کیفیت ہوتی ہے۔ یہاں جب کسی تقریب شادی پر دعوت اور نیوتہ ہو کر ملک ملک کی عورتیں جمع ہو کر اپنی اپنی بولی گاتی اور اپنی وضع پر ناچتی کودتی اور اپنے اپنے ملک کا لباس پہنتی ہیں تو وہ تماشا بھی قابل دید ہے۔ یہاں قوم کی پابندی جو ہندوستان کی پرانی بیماری ہے۔ یک قلم ترک ہوگئی۔ مسلمان مرد خواہ کسی ذات کا ہو ہر مسلمان عورت سے بلا روک ٹوک شادی کر لیتا ہے اسی طرح ہندوؤں میں بھی ہندو ہونا کافی وافی ہے۔ ایک ذات ہونا ضروری نہیں ہے۔ برہمنوں کے گھروں میں پاسنیں اور جاٹوں کے گھروں میں برہمنیاں موجود ہیں۔ یہاں ٹھگ وہ ٹھگ ہیں کہ دل کو ٹھگ لیویں۔ اور چور وہ چور ہیں کہ آنکھوں کا کاجل چرالیں۔ یہاں شعبدہ باز، بازیگر، بہروپیئے، بھنڈیلے، نقال، ہیجڑے، نٹ، طوائف، میراثی، گویئے، قوال اور ہر فن کے نیک و بد سب موجود ہیں۔ یہاں اچھے اور نیکوں کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی ملا و مولوی اور پنڈت اور درویش و بھائی جی وغیرہ سے خالی نہیں۔ یہاں مدراسی اور بنگالی سو کھی مچھلی بھی بڑے

مزے سے کھاتے ہیں۔ اس سوکھی مچھلی کو جس میں سڑے ہوئے چمڑے کی سی بُو ہوتی ہے۔ عمدہ عمدہ گوشت پر یہ لوگ سبقت دیتے ہیں۔ برہما چینا ہیتنی بھی کھاتے ہیں۔ مچھلیوں کو پلیوں میں بھر کر سڑانے سے جب ان میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو ان کیڑوں اور سڑی مچھلیوں کو کوٹ کر ہنی بنتی ہے۔ اور اس میں ایسی بدبو ہوتی ہے کہ ہم لوگ ہوا کے رُخ ایک میل تک بھی اس کی بدبو سہار نہیں سکتے۔ مگر برہما اور چینا اس کو بجائے گرم مصالح کے ہر عمدہ کھانے پر بُربُرا کر بڑے شوق سے کھاتے ہیں جب ان کو ہنی مل گئی تو گویا دنیا کی نعمت مل گئی یہاں کسی طوائف یا کسبی کی عام دکان نہیں ہے۔ مگر اکثر عورتیں ایسی بے حیا اور فاحشہ ہیں کہ کسبیوں کو ان سے شرم آتی ہے۔

بعد تجربہ کے مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنی اپنی وضع اور رسم اور بولی اور لباس و خوراک ہر کسی کو پسند ہے۔ جنگلی اپنے جنگل میں رہنے اور ننگ دھڑنگ پھرنے اور کیڑے مکوڑے کھانے کو ہماری قبا اور دوشالوں اور پلاؤ اور قلیہ پر سبقت دیتے ہیں۔ ہمارے کھانوں سے اُن کو نفرت ہونے لگتی ہے۔ ہمارے کپڑے پہننے سے اُن کو ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے ہم کو ننگا رہنے سے۔ برہما، چینا ہمارے گھی کے پکوان کو دیکھ کر اپنی ناک بند کر لیتے ہیں۔ ہمارے قلیئے،

تو رمے اور پلاؤ کے بھنگارے سے عربوں کا دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے ۔ انگریز لوگ ہمارے عطر کو نہیں سونگھ سکتے ۔ غرض بچپن سے زبان اور ناک جس چیز کا عادی ہو گیا ہے وہی اس کو پسند ہے ۔

سواد ہند کو روانگی

جب میں ۹ ماہ نومبر ۱۸۵۳ء کو سوار ہونے کو تھا تو اس وقت میں نے ایک عام دعوت کر کے اپنے سب دوستوں کو مدعو کیا تھا ۔ اس دعوت کی پیشانی پر لکھا تھا کہ یہ خاکسار بعد ایک قیام اٹھارہ برس کے بظاہر ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کو جانے والا ہے ۔ التماس کہ آج میرے کل عنایت فرما جن کے نام نامی درج ذیل ہیں قدم رنجہ فرما کر خاکسار کے ساتھ آخری ماحضر تناول فرما کر مشکور و ممنون فرماویں ۔

جس کسی کو یہ دعوت پہنچی بلا عذر دوڑا چلا آیا ۔ یہ دعوت میرے گھر میں میرے سوار ہونے سے فقط ایک گھنٹہ پہلے دوپہر کے وقت ہوئی تھی

میری جدائی سے حاضرین کے منہ پر رو داشک جاری تھی ۔ ہر چند بہت لوگوں نے
اِس جلسۂ مفارقت میں کچھ کچھ سپیچ (تقریر) کرنا چاہا۔ مگر دو لفظ کہنے کے بعد
ہر کسی کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔ میں خود بھی جو ایک تقریر طویل نصیحت آمیز کرنے کو تھا
ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکا اور دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ اس دن اتفاق
سے جمعہ تھا۔ بعد تناول طعام مولوی لیاقت علی صاحب کے ساتھ آخری
نماز جمعہ پڑھ کر گاڑیاں تیار کھڑی تھیں میں معہ لواحقین خود سوار ہو کر جزیرۂ
روس کو چلا آیا۔ وہاں میرے ہمراہ بھی صدہا مرد عورت سب مجھے رخصت کرنے کو
آئے تھے۔ جب بوقت چار بجے شام کے میں معہ لواحقین خود مقام جزیرۂ روس
سے کشتی پر سوار ہو کر اگنبوٹ کو چلا تو بیشمار خلقت خوشی اور رنج سے زار زار
روتی تھی۔ اس وقت میرے ساتھ ایک میری بیوی اور آٹھ بچے معہ میرے
کل دس نفر تھے۔ اور قریب آٹھ ہزار روپیہ کے میرے قبضہ میں جائداد تھی
اُس وقت میں اپنی اُس حالت کو کہ جب میں ۱۱ر جنوری ۱۸۶۶ء کو اسی
گھاٹ میں ایک لنگوٹی باندھ کر تن تنہا جہاز سے اُترا تھا۔ اور اب ایسی
رنج دمحن کی جگہ سے معہ دس نفر اور آٹھ ہزار کی جائداد کے واپس جاتا ہوں
یاد کر کے قدرتِ خدا پر تعجب کرتا تھا کہ حکام دنیا نے مجھ کو بے خانماں کر کے
سخت سزا کے واسطے یہاں بھیجا تھا۔ مگر اس حاکم حقیقی نے در اصل جس کے
ہاتھ میں ساری دنیا و مافیہا کا انتظام ہے دشمنوں کے ہاتھ سے میرے ساتھ

کیسے سلوک کرائے اور مجھ ایک فرد واحد سے دس نفر میرے اہلبیت کے کر کے کس اعزاز اور اکرام سے مجھ کو واپس لے چلا۔ اور چونکہ یہ جہاز جس پر میں سوار ہونے کو تھا اسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ جمنا جہاز جو مجھ کو لے کر آیا تھا کھڑا ہوا تھا۔ اور اس دن میں فجر کے وقت جمنا جہاز سے اترا تھا اور آج شام کے وقت مہارانی اگنبوٹ پر سوار ہونا تھا۔ اس واسطے مجھ کو اٹھارہ برس تک اس جزیرے میں رہنا ایک خواب وخیال معلوم ہوتا تھا۔ اور ایسا خیال میں آتا تھا کہ میں آج فجر کو جمنا جہاز سے اترا تھا اور آج ہی سوار ہو گیا۔ میں نے اپنے چلنے سے چند روز پہلے بقدر راہ خرچ کے اپنے پاس رکھ کر باقی کل نقد روپیہ کو جو اس وقت میرے پاس موجود تھے حسب سہام شرعی اپنی دونوں بیویوں پر تقسیم کر کے ہر ایک کے حوالہ کر دیئے اور آپ اس دولت دُنیا سے سبکدوش ہو گیا۔ اب میری ذاتی جائداد سوائے چند کتابوں اور چند جوڑے کپڑوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس قدر نقد وجنس وزیور وغیرہ میری جس بیوی کے قبضہ میں ہے وہ اُنہیں کا مال ہے۔ دوسری بیوی کا اس میں کچھ دعویٰ نہیں۔ قریب پانچ بجے شام کے ہم نے اگنبوٹ مہارانی نام پر سوار ہو کر ایک ہلکہ پر اپنا ڈیرہ کر لیا۔ ہم لوگوں کے سوا اس جہاز پر اور بھی بہت سی رہائی والی عورتیں اور مرد اور نیز بہت سے مسافر یورپین اور ہندوستانی سوار تھے موسم نہایت عمدہ اور سمندر بالکل ٹھنڈا تھا۔ موج اور

تلاطم کا نام نہ تھا۔ اُس دن محرم کی بھی دسویں تاریخ اور صدی چودھویں شروع ہوگئی تھی۔ بوقتِ غروب آفتاب کے جہاز کا لنگر اُٹھایا گیا۔ اور ہم لوگوں نے باچشمِ پُرآب ایک کے بعد ایک جزائر انڈمان کو خیرباد کہہ کر پیچھے چھوڑنا شروع کیا۔ اَب رات ہوگئی تھی۔ چاندنی رات میں سمندر کی لہروں کی کیفیت بڑی آب و تاب دِکھلا رہی تھی۔ دوسرے دن ہمارا جہاز جزیرۂ کوکو میں پہنچا۔ دو روز چلنے کے بعد کسی قدر پانی بھی برسا جس سے مسافروں کو کچھ تکلیف ہوئی مگر جب جہاز تھوڑا آگے بڑھ گیا تو تکلیف رفع ہوگئی اور پانی بھی بند ہوگیا علی رضا نام ایک مشہور تاجر نے اِس جہاز پر ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔ دونوں وقت عمدہ کھانا، گوشت، مچھلی، چائے، کافی، برف، اور قسم قسم کے میوے اور مٹھائیاں ہمارے واسطے ہردم موجود رہتی تھیں۔ بڑے آرام اور راحت سے یہ سفر کٹا جس وقت مارے برسات کے سب مسافر پانی میں تر بتر کانپ رہے تھے اُس وقت نورالدین نام ایک رہائی والے کی عورت کو دردِ زہ شروع ہوا۔ اور اسی حالت میں کہ زچہ پانی میں شرابور کانپ رہی تھی اس کو پلوٹھا بچہ پیدا ہوا۔ اور وہاں اچھوانی کہاں اتنی مشکل سے زچہ کو دالیں بھات ملا ہوگا۔ مگر اس کو یا اس کے بچہ کو کچھ مرض ہوا نہ بیماری بلکہ دونوں صحیح تندرست تھے۔ اور جب جہاز کلکتہ میں جا کر لنگر انداز ہوا اُس بچہ نوزائیدہ کی عمر صرف دو دن کی ہوگی۔ اُس کی والدہ معہ اپنے بچہ کے خندہ ناتی ہوئی

جہاز سے اُتر کر چلی گئی۔ اور پھر کلکتہ سے اُس کے مرد نے ایک ٹکٹ سیدھا لاہور تک کا لیا۔ اُسی حالت میں زچہ معہ بچہ خوش وخرم روانہ ہوگئی۔ اور بچہ کا نام بوجہ سمندر میں پیدا ہونے کے سمندر رہی رکھا گیا تھا۔ خیر بفضل الٰہی ہم چار دن اور چار رات کے سفر کے بعد ۱۳ نومبر ۱۸۸۳ء مطابق ۱۴ محرم ۱۳۰۱ھ داخل کلکتہ ہوئے۔ اور وہاں چنیا پاڑہ میں جاکر مولوی عبد الرؤف صاحب برادر مولوی عبد الرحیم صاحب کے مکان میں فروکش ہوئے۔ دو روز تک مولوی صاحب موصوف کے مکان میں رہ کر تیسری شب کو بوقت نو بجے رات کے ہم بسواری ریل کلکتہ سے ہند کو روانہ ہوگئے۔ اور کلکتہ سے الہ آباد اور وہاں سے کانپور اور کانپور سے علی گڈھ اور علی گڈھ سے سہارنپور اور وہاں سے انبالہ تک کا منزل درمنزل ٹکٹ لیتے ہوئے ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء کو بوقت ۸ بجے شب کے اِسٹیشن کیمپ انبالہ پر پہنچ گئے۔ کلکتہ سے دو سپاہی ایک نائک ہمارے اہل وعیال اور مال کی حفاظت کے واسطے بطور اردلی انبالہ تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔ انڈمان میں بارہ ماس موسم معتدل رہنے کے سبب سے میرے بال بچوں نے اس سے پہلے کبھی جاڑا گرمی نہ دیکھا تھا۔ اِسی واسطے اخیر نومبر میں کلکتہ سے آگے بڑھ کر اُن کو کسی قدر سردی سے تکلیف بھی ہوگئی۔ مگر جس جس قدر موسم سرما اور سرد ملکوں کا قرب ہوتا گیا۔ اُسی قدر اُن کی طبیعت بھی اس کی عادی ہوتی گئی

بیس برس کے اُس زندانِ قفس اَولادِ آدم سے نکل کر راہ میں جگہ بجگہ کا ہوا پانی اور طرح طرح کے موسمی میوے وغیرہ سے میرے بال بچوں کی طبیعت نہایت شاداں و فرحاں تھی۔ اِس سبب سے پورٹ بلیر سے انبالہ تک دن عید اور رات شب برات کی کیفیت رہی۔

ایک وہ دن تھا کہ ہم ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو جیل انبالہ سے زیور آہنی و جوگیانہ لباس و گلیم سیاہ سے آراستہ پیراستہ ہو کر زیر حراست پولیس انبالہ سے مغرب کو روانہ ہوئے تھے اور بڑے مصائب کھینچتے ہوئے ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو گیارہ ماہ بعد تاریخ روانگی انبالہ سے کالے پانی میں داخل ہوئے تھے اور یا یہ دن ہوا کہ ہم بڑی آسائش سے دریائی سفر کو طے کر کے کلکتہ میں پہنچے اور وہاں سے ایک خاص درجہ ریل میں بلا شرکت اَحدے سوار ہوتے ہوئے دس آدمیوں کے عیال اور نقد و جنس کو ساتھ لے کر مثل نوابوں کے عمدہ سلطانی بانات کا لباس پہنے ہوئے پورٹ بلیر سے چل کر گیارھویں دن مشرق سے آکر داخل انبالہ ہوئے میری اس کیفیت اور شان اور اولاد اور مال و منال کو دیکھ کر خلقت کو تعجب اور متعصبوں کو افسوس اور میرے ہوا خواہوں کو خوشی تھی۔ راہ میں بھی جہاں جہاں میں اترتا ہر شہر کے مسلمان میرا نام سن کر میری ملاقات کو دوڑے چلے آتے اور میری کیفیت کو دیکھ کر یہ کہتے تھے کہ اللہ جل جلالہٗ بڑا قادر ہے

وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ راہ میں یا انبالہ میں جو جو آدمی میرے مقدمہ اور حالات سے واقف تھے وہ سب کہتے تھے کہ تیرا اِس ملک میں اِس شان سے آنا مردے کے زندہ ہونے سے کم نہیں ہے جو اِس کرامت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی قدرت پر ایمان نہ لاوے البتہ وہ دل اور آنکھ دونوں کا اندھا ہے ذرا غور تو کیجئے کہ یہاں میری ایک بیوی چھوٹی تھی۔ کالے پانی میں مجھ کو دو بیویاں عنایت ہوئیں یہاں میرے دو بچے چھوٹے تھے وہاں آٹھ بچے مرحمت ہوئے۔ اور سامان اور اسباب نقد و جنس ہر ایک چیز کا نام بنام نعم البدل اِس قید خانہ میں دے کر مجھ کو واپس لے آیا۔ جیسے کہ حضرت ایّوب علیہ السّلام کے مقدمہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں فرمایا ہے :۔

وَاٰتَیْنَاہُ اَھْلَہٗ وَمِثْلَھُمْ مَّعَھُمْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِکْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ :۔

دیا ہم نے اس کو کنبہ اُس کا اور زیادہ دیئے اُس کو اُس کنبے کے ساتھ مثل اُس کی۔ یہ ایک رحمت تھی ہماری طرف سے اور ایک نصیحت تھی واسطے عابدوں کے۔ یہ آیت میرے حق میں بھی از سرتا پا صادق آئی۔ مگر اِس میرے قصہ سے جو ایک بڑی روشن آیت آیاتِ الٰہی سے ہے۔ صرف عابدین اور صالحین ہی کو عبرت اور نصیحت ہوسکتی ہے۔ منکرین اور منافقین کو نہیں۔

وطن پہنچ کر

دوسرے دن فجر کو ہم شہر انبالہ میں پہنچے۔ اور وہاں کے حکام ضلع سے اجازت لے کر کیمپ انبالہ میں اپنے آقائے قدیم کپتان ٹمپل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب میں کپتان ٹمپل صاحب کے بنگلہ پر گیا وہ دوڑکر میرے ملنے کو باہر نکل آئے۔ اور اندر لیجا کر مجھکو موڑھے پر بٹھلایا اور بہت تسلی اور تشفی کی اور فرمایا کہ آج کی تاریخ سے ہم بیس روپیہ ماہوار تنخواہ تم کو اپنے رنج سے دیا کریں گے۔ اور تمہاری نوکری کے واسطے بھی جلد اچھا بندوبست ہو جاوے گا۔ کپتان ٹمپل صاحب کی سعی سے بہت سے صاحب لوگ مجھ سے پڑھا کرتے تھے۔ میرے یہاں پہنچنے کے سوا برس بعد تک ٹمپل صاحب یہاں رہ کر مجھ کو قریب پچاس روپیہ ماہوار کے بندوبست کر دیتا تھا۔ اپریل ۱۸۸۶ء سے یعنی اُس کے چلے جانے کے بعد سے وہ بندوبست ٹوٹ گیا۔ بلکہ اس وقت سے نگرانی پولیس کی میرے اوپر مقرر ہو کر اور بھی سختی بڑھ گئی۔

بعد پہنچنے انبالہ کے جب میں نے اِس سفر بت سالہ کو نقشہ ہند سے

پیمائش کرکے دیکھا تو انبالہ سے چل کر براہِ لاہور و بمبئی کالے پانی تک اور پھر کالے پانی سے براہِ کلکتہ انبالہ تک قریب سات ہزار میل کے مسافت ہوئی۔ اور باستثناء بعض شمالی اضلاع ہند کے قریب تمام کے کل ہند کا طواف ہو گیا۔

صدر بازار کیمپ انبالہ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر معہ عیال و اطفال خود اس میں آباد ہو گیا۔ جب میں سب اسباب ضروری خانہ داری کا خرید چکا تو ۱۱؍ دسمبر ۱۸۸۳ء کو ایک ہفتہ کی رخصت لے کر براہ ریل اوّل دہلی گیا۔ اور وہاں ایک شب رہ کر دوسرے دن شام کو بسواری یکّہ پانی پت پہنچا اور باتفاق حسنہ سے پورے بیس برس کے بعد وہی ۱۲؍ دسمبر میرے پانی پت سے دہلی کو بھاگ جانے کی تاریخ تھی کہ جب میں ۲۰ برس پہلے تھانیسر سے سوار ہو کر بوقت صبح اپنی بیوی کو پانی پت میں چھوڑ کر اور پانی پت سے یکہ پر سوار ہو کر دہلی کو بھاگا تھا۔ جب میں پانی پت کی جانب مشرق و جنوب کی سڑک پر شام کے وقت دہلی سے پانی پت کو چلا آتا تھا۔ تو وہی سڑک اور وہی موسم اور وہی تاریخ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج فجر میں اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر دہلی کو گیا تھا اور آج ہی واپس آ گیا۔ خیر مغرب کی نماز کے بعد میں بمقام پانی پت اپنے گھر میں پہنچا۔ میری بیوی اور لڑکے مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ بروز فرار جس لڑکے کو میں نے چند مہینے کا چھوڑا تھا۔

اب اس کو بیس برس کی عمر میں دیکھا۔ پانچ روز وہاں ٹھیرنے کے بعد پھر میں براہِ کرنال تھانیسر آیا۔ اور ایک شب چند گھنٹے تھانیسر میں ٹھیر کر پھر انبالہ کو لوٹ آیا۔

جس جس شہر میں یہ عاجز گیا۔ ہزاروں خلقت اس شہر کی میرا آنا سن کر میرے دیکھنے کو آتی تھی۔ اور تھانیسر میں تو ایسا اژدہامِ خلائق کا ہوا کہ میں اس رات کو سونے بھی نہیں پایا۔ بلکہ بسبب تنگی وقت کے بہت سے آدمی میری ملاقات سے محروم رہ گئے۔ اور انبالہ میں چند مہینوں تک منزلوں سے لوگ میرے دیکھنے کو آتے رہے۔ اور میرا منہ دیکھ کر خدا کی قدرت پر تعجب کرتے تھے۔

شہر تھانیسر کو میں نے دیکھا کہ ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء اس سے میرا قدم اٹھانا تھا کہ اس پر زوال شروع ہوا۔ اس بیس برس میں ساتویں حصہ سے بھی کم اس کی آبادی رہ گئی۔ مکانات گر کر راہ کوچے بند ہو گئے۔ اور بجائے آدمیوں کے بندر اور چیتیوں نے اس میں اپنا دخل کر لیا۔ لیکن خداوند کریم نے مجھ کو قرائن سے معلوم کرا دیا کہ یہ شہر عنقریب بڑی دھوم دھام سے پھر دوبارہ آباد ہوگا۔ جب میں تھانیسر میں گیا۔ تو میں نے اپنے مولد اور مکان مسکن پر جا کر مالک مکان سے جو اس میں آباد تھا۔ عاجزی تمام یہ اجازت چاہی کہ اپنے زنانوں کو کسی ایک کمرے میں علیحدہ کر کے مجھ کو اس مکان کے

اندرونی قطعات کی زیارت کر لینے دو۔ مالکِ مکان نے مجھ کو شناخت کر کے بڑے اخلاق سے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ مجھ کو اس جگہ بھی قدرت الٰہی یاد آئی۔ کہ جس مکان کو میں نے خود ہزاروں روپیہ خرچ کر کے تعمیر کیا تھا اَب اُس کے اندر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ اَب میں امید کرتا ہوں کہ خداوند کریم اِس ہدیہ اور نذرِ مکان کو ریا سے پاک کر کے قبول کر لیوے۔ اور اس کا بدل کوئی مکان آخرت میں عطا کرے۔ اَب بعد اختتام اِس کیفیتِ بست سالہ کے بعض اِنعاماتِ الٰہی کو ذکر کر کے میں اِس کتاب کو ختم کر دیتا ہوں۔

خاتمہ

ایک ان میں سے یہ ہے کہ تاریخ قید سے جہاں جس جگہ میں رہا۔ کیسے اپنے سایۂ عاطفت اور انعام میں مجھ کو رکھا۔ بیس برس میں ایک دن بھی مشقت کرنے کی نوبت نہ آنے دی۔ اور کالے پانی میں میرے پہنچنے سے پہلے میری راحت کے سامان جمع کر رکھے تھے۔ جہاں پر ٹھیرنے ہی کے دن مجھ کو بڑا عہدہ دارِ سرکار بنا دیا۔ اور ہمارے کالے پانی میں پہنچنے سے فقط چار پانچ برس

پہلے ان نئے جزائر کا آباد ہونا اور اس سبب سے قوانین پورٹ بلیر کا قیدیوں کے واسطے نرم اور آسان مقرر ہونا اور ہمارے وہاں داخل ہونے کے وقت تک جنگل کی صفائی اور مہلک امراض کا قطعی دفعیہ ہو کر اس کا رشک کشمیر ہو جانا اور پھر بیس برس تک بڑے آرام و عیش سے ہمارا وہاں رہنا اور ایسی جائے نا امیدی سے باوجود تعصب حکام باشان و شوکت مال و اولاد صحیح و تندرست جیسے گئے تھے اس سے بہتر حال میں واپس آ جانا۔ دوسرے اس ملک ہند میں ہمارے واپس پہنچنے کے بعد بھی باوجود سخت تخالف اور تباین آب و ہوا پورٹ بلیر انڈمان اور ہندوستان کے میرے بال بچے اب تک صحیح سالم اور تندرست ہیں۔ بلکہ اور دو بچے اس ملک میں آ کر بھی میرے گھر میں پیدا ہوئے حالانکہ اور دوسرے بچے جو کالے پانی سے یہاں واپس آئے۔ بہت ہی کم اس ملک میں زندہ رہے۔ اور جب کوئی وبا یا متعدی مرض اس ملک میں پھیلتا ہے تو یہ چھاؤنی یا میرا گھر ہمیشہ اس سے محفوظ رہتا ہے۔ اور میرے یہاں پہنچنے کے بعد بارش باران اور ارزانی غلہ بھی بہ نسبت سنین ملحقہ کے نہایت کثرت سے ہوئی۔ تیسرے جب بعد بیس برس کے اس جزیرے سے میری رہائی ہوئی۔ تو بہ تقاضائے بشریت مجھ کو یہ فکر تھا کہ اس وقت میں ہندوستان میں جا کر کہاں رہونگا اور کیا کرونگا۔ کیونکہ بمقام تھانیسر میرے کل مکانات سکنی و اراضی زمینداری وغیرہ ضبط سرکار ہو کر نیلام ہو چکے تھے۔ اور حکام ضلع انبالہ

ہمارے اکثر وہی پرانے رفیق تھے جنھوں نے ہم کو کالے پانی بھیجا تھا۔ مگر ایسے وقت تردد اور انتشار میں اس قادر کریم اور مقلب القلوب نے کپتان ٹیمپل صاحب مجسٹریٹ کیمپ انبالہ میں بلایا اور اس میری شروع واپسی میں کہ جب ہر ایک انگریز میری صورت سے متنفر تھا۔ بطور وکیل مدتوں میری طرف سے لڑتا رہا۔ اور روزگار وغیرہ کی طرف سے بالکل مجھ کو فارغ البال کرا دیا۔ اور جب ٹیمپل صاحب بوجہ تبدیلی خود اس ملک سے چلے گئے تو اس کے بعد خود بخود بلا میری درخواست کے ریاست ارنولی میں میرا روزگار معقول مقرر کرا دیا۔ کہ جہاں میں اب تک بڑے آرام اور آسائش سے نوکر ہوں اور یہ بھی اس کا شکر ہے کہ یہ دونوں سبب میرے روزگار اور آسائش کے غیر مسلموں کے ہاتھ سے ہوئے کہ جہاں سوائے تائید غیبی کے کوئی ظاہری گمان ہمدردی قوم وغیرہ کا بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے ہندوستان میں واپس آنے کے بعد جو نگرانی پولیس وغیرہ ہمارے اوپر مقرر ہوئی تھی اول تو اس کو بذمہ داری وضمانت خود کپتان ٹیمپل صاحب نے میرے اوپر سے اٹھوا دیا تھا۔ اور بعد تبدیلی کپتان ٹیمپل صاحب کے محض بتائید غیبی بلا سعی وسفارش کسی بشر کے وہ احکامات نگرانی وغیرہ بذریعہ چٹھی نمبری ۱۸۸ مورخہ ۶ ہر فروری ۱۸۸۸ء منجانب سکرٹری گورنمنٹ پنجاب بنام صاحب کمشنر قسمت دہلی میرے اوپر سے اٹھوا دیئے گئے حالانکہ میرے پانچوں رفقاء جیل یعنی مولوی عبد الرحیم وغیرہ پر سے وہ احکامات

نگرانی ابھی تک بھی نہیں اُٹھائے گئے۔ بفضلِ الٰہی اَب میں قطعی آزاد ہوں جہاں چاہوں رہوں اور جو چاہے روزگار کروں۔ بضرورت کاروبار ریاست میں لاہور اور کلکتہ کے مابین میں ہمیشہ دورہ سیر میں رہتا ہوں۔ بلکہ عنقریب ایک مقدمۂ ریاست ارنولی کی پیروی میں میرا ولایت جانے کا بھی ارادہ ہے۔ جہاں انشاء اللہ تعالیٰ ڈاکٹر ہنٹر صاحب اور دوسرے موافق اور مخالف صاحب لوگوں سے ملاقات کرکے اِس قدرتِ الٰہی کا اُن سے اعتراف کراؤں گا۔ جب میں کچہری انبالہ کے اُس مقام کو دیکھتا ہوں کہ جہاں مجھ کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تھا۔ اور یا جب جیل انبالہ کے پاس سے نکلتا ہوں جس میں ڈیڑھ برس تک قید رہا تھا۔ اور یا ان سڑکوں پر گذرتا ہوں جہاں سے بعد سنانے حکم پھانسی کے ہم کو جیل خانہ کو لے گئے تھے۔ تو قدرتِ الٰہی کو دیکھ کر میرا دل ہل جاتا ہے اور یہ خیال ہو جاتا ہے کہ بروز سنائے جانے حکم پھانسی کے کس کو گمان تھا کہ پھر میں اِس کمرۂ عدالت میں یا ان مقاموں پر کبھی کھلا ہوا بے روک ٹوک پھروں گا ہرگز کسی بشر کو گمان کیا اس کا وہم بھی نہ تھا۔ یہ فقط اُس رَب قدیر کا کام ہے۔ کہ یہ سارے تماشے گرم سرد زمانہ کے دکھلا کر اس اپنے نالائق مغرور غلام کو پھر جیسے کا جیسا اِس ملک میں لا کر پہلے سے دہ چند لوگوں کی آنکھوں میں معزز اور ممتاز کر دیا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

اِس قِصّہ کو ایک کہانی یا ایک مثل فوجداری کا ترجمہ ہی نہ سمجھو۔ بلکہ یہ قِصّہ ایک بڑی آیت آیاتِ الٰہی سے ہے۔ اِس کو بار بار چست ملاحظہ کرکے عبرت پکڑنا چاہیئے خداوند تعالیٰ اپنی کتاب مجید میں ایسے ہی قِصّہ کی نسبت فرماتے ہیں:۔ لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (ترجمہ) تحقیق اِن قِصّوں میں ایک عبرت اور نصیحت ہے عقلمندوں کے واسطے اور تعمیل حکم ربانی وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔ (ترجمہ) اپنے رب کے انعاموں کو لوگوں میں بیان کرو۔ میں نے جملہ انعامات ظاہری اور باطنی خداوند عالمین جل جلالہ وعم نوالہ کو بقدر اپنی سمجھ کے بطور اختصار کے لکھ کر پبلک کے سامنے پیش کردیا ہے۔ اَب یہ آخری دعا ہے کہ خداوند کریم اِس محنت اور مشقت اور اُن تکالیف قید کو ریا سے پاک کرکے قبول فرماوے اور ناظرین کو اِس قِصّہ سے عبرت اور نصیحت ہوتی رہے۔ آمین۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ

تمت

نفیس ترین لٹریچر

نام کتاب	روپیہ	آنے	نام کتاب	روپیہ	آنے
اسلام کا نظام حیات	۴	۴	ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ	۲	۱۲
حکومت الٰہیہ	۲	۴	ہندوستان کی سیاسی الجھنیں	۲	۱۲
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	۳	۱۲	تشریحات پاکستان	۲	۱۴
اسلامی نظریۂ اجتماع	۲	۱۲	معاشیات پاکستان	۱	۱۰
اسلام کا نظام عدالت و دیات	۲	۱۲	ہمارا پاکستان	۰	۱۲
اسلام اور سود	۳	۸	پاکستان مخالفین کی نظر میں	۱	۰
تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ	۳	۱۲	تصورات پاکستان	۲	۱۲
اسلام کے سیاسی تصورات	۲	۱۲	قائدین کے خطوط جناح کے نام	۲	۰
تاجدار دو عالم	۳	۱۲	گاندھی جناح مراسلت	۰	۱۲
داستان کربلا	۲	۱۲	مقالات جمال الدین افغانی	۲	۱۴
ذکر جمیل۔ نعتیہ کلام	۱	۸	مقام جمال الدین افغانی	۳	-

کتاب	روپیہ	آنہ	کتاب	روپیہ	آنہ
قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم	۲	۱۲	افادات محمد علی مرحوم	۲	۳
سیر افغانستان	۲	۸	نانیت	۴	۱۲
فکر فرنگ	۲	۸	کانگریسی علماء	:	۱۲
فلسفیوں کے خواب	۲	۸	فلسفہ عجم	۲	۴
فلسفہ امن	۲	۸	تصورات اقبال	۳	۶
جہان آرزو	۲	۱۲	بھوکا ہے بنگال	۲	۱۴
کرنل لارنس	۲	۱۲	آج کل کے افسانے	۲	۱۲
کوہ نور کی سرگزشت	۱	۱۴	کسک ۔ ″	۲	۱۴
نئے ادبی رجحانات۔	۳	۸	غبار ۔ ″	۲	۴
نثر ریاض خیرآبادی	۲	۸	سرنوشت	۲	۰
جگر مرادآبادی	۲	۸	مظلوم دوشیزہ	۳	۰
سہیل کی سرگزشت	۲	۱۲	طوفان ۔ ناول	۳	۶
زہریلے آنسو	۲	۸	عشرت ۔ ″	۲	۸
نکتہ چیں ہے غم دل	۳	۴	مستقبل کے سوداگر ناول	۱	۱۲
کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں	۲	۱۲	خطا ۔ (″)	۴	۰
چالیس کروڑ بھکاری	۲	۱۲	پیلٹ کی ماری ۔ ″		
تکونا دیس	۲	۱۲	دل کی آگ ۔ (″)		